ہنگاموں کا شہر
اشتیاق احمد

نام ناول ——— ہنگاموں کا شہر

بار اول ——— یکم اگست ۱۹۸۶ء

طابع ——— اشتیاق احمد

مطبع ——— زاہد بشیر پرنٹرز لاہور

سرورق ——— محمد جاوید چغتائی

طباعت سرورق ——— سپریم پرنٹرز لاہور

کتابت ——— محمد سعید نامدار

قیمت ——— چھ روپے

سالانہ قیمت ——— تین سو روپے

اشتیاق پبلیکیشنز

۹/۱۲ نصیر آباد، ساندہ کلاں، لاہور

حدیث شریف

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دین (دینِ محمدیؐ) ہمیشہ قائم رہے گا۔ اور اس کے باقی رکھنے کے لیے مسلمانوں کی ایک جماعت ہمیشہ جہاد کرتی رہے گی۔ جب تک قیامت قائم ہو۔

(صحیح مسلم)

ممالکِ غیر سے سالانہ قیمت

انگلینڈ	-/۵۸۴ روپے	عمان	-/۴۵۶ روپے
دوبئی	-/۴۵۶ "	سعودی عرب	-/۴۴۸ "
کویت	-/۴۴۸ "	شارجہ	-/۴۵۶ "
دوحہ قطر	-/۴۶۸ "	ابوظہبی	-/۴۶۸ "

السلام علیکم!

میرے ایک قاری سید عرفان علی نے کاپی سائز کے بیس صفحات کا ایک خط مجھے لکھا ہے۔ پہلے تو میں اس قدر طویل خط کو دیکھ کر گھبرایا؟ پھر سوچا، چلو سرسری انداز میں پڑھ لیتا ہوں۔ لیکن پھر خط کو مکمل طور پر پڑھنے پر مجبور ہو گیا نہ صرف پڑھنے پر۔ بلکہ شائع کرنے پر بھی۔ خط پڑھنے کے دوران میں کئی بار مسکرایا۔ کئی بار حیرت زدہ رہ گیا۔ اور کئی بار ہنس بھی پڑا۔ لہذا میں چاہتا ہوں۔ آپ بھی کئی بار مسکرا دیں، کئی بار حیران رہ جائیں اور کئی بار ہنس دیں۔ کیوں کہ یہی سید عرفان علی کا حق ہے۔ اور معلوم ہوا۔ محنت کا پھل ضرور ملتا ہے۔ تعریف میں لکھے جانے والے کئی جملے کاٹ کر خط کو شائع کیا جا رہا ہے۔ کہیں آپ یہ نہ کہہ اٹھیں۔ خط چونکہ تعریفی تھا، اس لیے شائع کیا گیا ہے، لیکن ایسی کوئی بات نہیں۔ بس ان کی محنت دیکھ کر میں نے خود کو مجبور پایا۔ اس ماہ کے کسی ناول کے آخر میں آپ یہ خط پڑھ سکیں گے۔ شکریہ!

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

- یہ وقت نماز کا تو نہیں ــــ
- آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا ــــ
- کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں ــــ
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا ــــ
- آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں۔ پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہولیں، پھر ناول پڑھیں۔ شکریہ!

مخلص:

اشتیاق احمد

ایک منٹ

شہر میں داخل ہوتے ہی خان رحمان نے اپنی کار روک لی:

"خیر تو ہے ابا جان! کار میں کوئی خرابی ہو گئی ہے؟" ناز نے پریشان ہو کر کہا۔

"نہیں بیٹی! یہاں سے کسی اچھے ہوٹل کا پتا کر کے آگے بڑھیں گے۔" انھوں نے کہا اور پاس سے گزرتے ایک موٹر سائیکل سوار کو رکنے کا اشارا کیا۔ ان کا اشارا پاتے ہی اس نے یک لخت رفتار بڑھا دی اور ہوا ہو گیا۔ ان کے پاس سے زن کر کے گزر گیا:

"شاید پاگل تھا۔" حامد بولا۔

"ہاں! کوئی بات نہیں۔ وہ دیکھو۔ ایک سائیکل سوار آ رہا ہے۔" خان رحمان نے کہا اور پھر جوں ہی سائیکل نزدیک آئی، انھوں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا:

"ایک منٹ بھائی صاحب۔"

ان کا ایک منٹ بھائی صاحب کہنا تھا کہ سائیکل سوار کا رنگ اُڑ گیا اور وہ تیزی سے پیڈل مارنے لگا۔ یہ دیکھ کر ان کی حیرت بہت بڑھ گئی۔ خان رحمان کار سے اُترتے ہوئے بولے:

"یوں کام نہیں چلے گا۔ شاید یہ سارا شہر پاگلوں کا ہے۔"

اس مرتبہ ایک راہگیر ان کے پاس سے گزرا۔ وہ اس کے راستے میں آ گئے اور بولے:

"آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"نن۔ نہیں۔ ارے باپ رے۔" اس نے گڑبڑا کر کہا اور کنی کترا کر نکل جانا چاہا۔ لیکن خان رحمان نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ لگا کانپنے۔ چہرے کا رنگ اُڑ گیا:

"م۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ جو کچھ ہے۔ لے لیں۔ لیکن مجھے جان سے نہ ماریں۔" اس نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا۔ مجھے کیا پڑی ہے۔ تمہیں جان سے ماروں۔ میں تو ایک بہت امن پسند آدمی ہوں۔"

"جی۔ امن پسند آدمی۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"کیوں۔ کیا میں امن پسند آدمی نہیں ہو سکتا۔" خان رحمان نے آنکھیں نکالیں۔

"اس۔ اس شہر میں امن کہاں۔ یہاں تو ایک سے بڑھ کر ایک موجود ہے۔"

"ایک سے بڑھ کر ایک موجود ہے۔ کیا مطلب؟" انھوں نے کہا۔

"ہر بڑا اپنے سے چھوٹے کو دبا لیتا ہے۔ اس سے بڑا اس کو دبا لیتا ہے۔"

"یہ تو جنگل کا قانون ہو گیا۔" خان رحمان کے منہ سے نکلا۔

"اوہ ہاں! آپ ٹھیک سمجھے۔ بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔"

"خیر۔ اب تو اس شہر میں میری دل چسپی بہت بڑھ گئی ہے۔ ہم چند دن یہاں ضرور گزاریں گے۔ کسی اچھے سے ہوٹل کا پتا بتا سکتے ہیں آپ؟"

"ایک سے ایک اعلیٰ ہوٹل موجود ہے۔ لیکن سب کے سب ٹھگ ہیں۔ آپ یہ بتائیں ٹھگے جانے کی کس قدر ہمت ہے آپ میں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"یہ ہمت تو پیدا کرنا ہو گی:" انھوں نے گھبرا کر کہا۔

"تو پھر پیدا کر لیں۔ اور ناک کی سیدھ میں چلے جائیں، ہوٹلوں کے بازار میں پہنچ جائیں گے:"

"ہوٹلوں کا بازار۔ کیا مطلب۔ یہاں ہوٹلوں کا بازار بھی ہے؟" حامد نے بوکھلا کر کہا۔

"یہ پوچھیے۔ یہاں کس چیز کا بازار نہیں ہے:"

"اچھی بات ہے۔ پوچھ لیتے ہیں۔ بتائیے۔ یہاں کس چیز کا بازار نہیں ہے:" شہناز بیگم نے منہ بنایا۔

"شرافت کا بازار یہاں نہیں ہے:" اس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ میرے اشارے سے گھبرا کیوں گئے تھے؟"

"اس شہر میں ہر چھوٹا آدمی ہر بڑے آدمی سے اسی طرح گھبراتا ہے اور روکنے کا مطلب یہ خیال کرتا ہے کہ اب آ گئی مصیبت۔ لہٰذا مصیبت مول لینے سے لوگ کنی کترا جانا بہتر خیال کرتے ہیں:"

"ہوں۔ شکریہ۔ ہم سمجھ گئے۔ آخر یہاں ایسا کیوں ہے، کیا یہاں قانون نہیں ہے۔ پولیس نہیں ہے:" خان رحمان بولے۔

"قانون بھی ہے اور پولیس بھی۔ لیکن سب ایک ہی رنگ میں رنگ گئے ہیں:"

"اچھا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ جا سکتے ہیں:"

"شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے۔ کہ آپ نے مجھے کچھ نہیں کہا:"

"اس کا مطلب ہے۔ اگر میں آپ کے ساتھ کوئی زیادتی کرتا تو آپ پولیس سٹیشن جا کر رپورٹ بھی درج نہ کراتے:"

"جی نہیں۔ اس لیے کہ وہاں جا کر رپورٹ درج کرانے میں اور بھی دشواری پیش آتی۔ وہاں ایک سے ایک غنڈہ بیٹھا ہے:"

"ٹھیک ہے۔ آپ جا سکتے ہیں:"

"جانے سے پہلے ایک مشورہ دوں گا:" اس نے کہا۔

"ضرور کیوں نہیں:" خان رحمان جلدی سے بولے۔

"آپ یہیں سے واپس چلے جائیں، جہاں سے آئے ہیں، وہیں چلے جائیں۔ اسی میں آپ کی بہتری ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے پاس کار بہت قیمتی ہے۔ نقدی وغیرہ بھی پاس ہو گی:"

"ہاں! یہ تو ہے:"

"تب تو آپ فوراً اس سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ ہم یہیں رک کر غور کریں گے۔ مناسب خیال کیا تو واپس چلے جائیں گے۔"

وہ چلا گیا۔

"کیوں بھئی۔ اب کیا ارادہ ہے؟"

"شہر بہت دل چسپ ہے۔" حامد نے کہا۔

"گویا تم لوگ اس کی باتیں سن کر خوف زدہ نہیں ہوئے۔"

"جی نہیں۔ دل چسپی ضرور بڑھ گئی ہے۔" سرور بولا۔

"اچھا تو پھر آؤ۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔" خان رحمان نے کندھے اچکائے۔

وہ کار میں بیٹھ کر آگے روانہ ہوئے۔ اور پھر واقعی ہوٹلوں کا بازار شروع ہو گیا۔ بڑے بڑے عظیم الشان ہوٹل موجود تھے۔ ایک ہوٹل پر لکھا نظر آیا۔ جانباز ہوٹل۔ اور انھوں نے کار اس کے سامنے روک دی۔

کسی نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ہوٹل کے دائیں طرف ایک پختہ میدان تھا۔ اس کے سرے پر کار پارک کا بورڈ لگا نظر آیا۔ انھوں نے کار اس میں کھڑی کر دی۔

"حیرت ہے۔ یہاں تو ایک بھی کار نہیں کھڑی اور ہوٹل

اس قدر شان دار ہے۔ اندر سے کچھا کچھ بھرا ہوا بھی ہے۔ کیا یہ سب لوگ پیدل آئے ہوں گے۔" حامد بڑبڑایا۔

"پتا نہیں۔ آؤ۔"

انھوں نے اپنا سامان ڈکی میں ہی رہنے دیا۔ خود آگے بڑھے۔ ہوٹل کے دروازے پر کوئی چوکیدار موجود نہیں تھا، وہ اندر داخل ہوئے اور کاؤنٹر پر پہنچے۔

"ہمیں ایک ڈبل کمرہ چاہیے۔"

"مل جائے گا۔" اس نے بے فکری کے انداز میں کہا۔

"تو پھر دے دیں۔" خان رحمان منہ بنا کر بولے۔

"کتنے دن کے لیے۔"

"ایک ہفتے کے لیے۔"

"ایک ہفتے کا کرایہ اکیس ہزار روپے ہوگا۔ جو نقد وصول کیا جائے گا، لیکن میں آپ سے پچیس ہزار روپے لے لوں گا۔"

"کیا کہا۔ پچیس ہزار لے لوں گا۔ شاید آپ بھول میں کہ گئے۔ بیس ہزار کہنا چاہتے ہوں گے!" خان رحمان جلدی سے بولے۔

"جی نہیں۔ کرایہ اکیس ہزار ہوگا۔ آپ سے لے لوں گا پچیس ہزار۔ یہ بھی آپ کو خصوصی رعایت ہوگی۔ ورنہ میں تو ایک ہزار روپے یومیہ زیادہ وصول کرنے کا عادی ہوں،

اور یہ میری مرضی پر منحصر ہے۔ جی چاہے تو ایک پیسہ بھی زیادہ وصول نہیں کرتا۔"

"گویا آپ رعایت نہ کرتے تو اٹھائیس ہزار لیتے۔"

"ہاں! یہی بات ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ چیک لے لیں گے۔"

"جی نہیں۔ نقد رقم چلے گی۔"

انھوں نے حامد کو کار کی چابی دیتے ہوئے کہا:

"جاؤ۔ کار میں سے نقدی کا بریف کیس نکال لاؤ۔"

"کیا کہا۔ کار۔ آپ لوگ کار پر آئے ہیں؟" اس نے چونک کر کہا۔

"ہاں کیوں! کیا کار پر آنا جُرم ہے؟"

"اگر ڈرائیور کار میں بیٹھا ہے تو شاید کوئی جُرم نہیں۔ اور اگر ڈرائیور نہیں ہے تو پھر واردات ہو چکی ہے۔" اس نے عجیب بات کہی۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ میری بات آپ خود ہی جان جائیں گے۔ نقدی کا بریف کیس منگوا لیں۔"

"جاؤ حامد۔ ان کی بات سمجھنے کے لیے بریف کیس لانا ہی ہو گا۔" انھوں نے منہ بنا کر کہا۔

"ہاں بالکل۔" کاؤنٹر کلرک ہنسا۔

حامد نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ جلد ہی اس کی واپسی ہوئی تو چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"کیوں۔ کیا ہوا؟"

"کک۔ کار غائب ہے۔" اس نے کہا۔

"اوہ!" ان کے مُنہ سے ایک ساتھ نکلا۔۔

★

"اب آپ سمجھ گئے میری بات۔" کلرک چہک کر بولا۔

"ہاں! بہت اچھی طرح۔"

"جن لوگوں کے پاس ڈرائیور ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بھی یہاں کاریں پارک نہیں کرتے۔ آتے ہی واپس بھیج دیتے ہیں اور جب ان کے جانے کا وقت ہوتا ہے۔ کاریں منگوا لیتے ہیں۔"

"ہوں! خیر۔ میں دارالحکومت سے مزید رقم منگوا لیتا ہوں۔ بذریعہ فون رقم بنک میں منتقل ہو جائے گی۔ آپ کو ہمیں دے دیں۔ ادائیگی ہو جائے گی۔"

"نہیں جناب۔ یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ رقم پہلے وصول کی جائے گی۔"

"اوہ۔ اچھا۔ کیا میں یہاں سے فون کر سکتا ہوں؟"

"اس کے بھی پیسے پہلے دینا ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں دو کالیں کروں گا۔"

"دونوں دارالحکومت کریں گے نا۔" اس نے کہا۔

"ہاں! بالکل۔"

"دو ہزار روپے دے دیں۔"

"دو کالوں کے دو ہزار۔"

"باہر جا کر کرلیں۔ دو ہزار میں بھی نہیں کر سکیں گے، اس شہر میں پبلک فون بوتھ نہیں ہیں۔ ٹیلی فون آفس میں بہت لمبی قطار لگی ہوتی ہے۔"

"اوہ اچھا۔" انھوں نے کہا۔ پرس نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر دھک سے رہ گئے۔ جیب میں پرس نہیں تھا۔ ان کا رنگ اڑ گیا۔

"کیا ہوا؟"

"ہم۔ میرا پرس بھی غائب ہے۔"

"ہوں۔ کسی آدمی سے ملاقات کی تھی آپ نے سڑک پر؟"

"ہاں! ایک راہگیر کو روک کر ہوٹل کا پتا پوچھا تھا۔"

"بس وہی پرس لے گیا۔"

"ارے نہیں۔ وُہ تو بہت شریف آدمی تھا۔"

"اسی لیے تو صرف پرس لے گیا۔ ورنہ کار تو ہی لے جاتا، اور آپ سڑک پر کھڑے ہاتھ ملتے رہ جاتے۔"

"آخر۔ یہ کس قسم کا شہر ہے؟" انھوں نے چیخ کر کہا۔

"بس۔ ایسا ہی ہے یہ۔"

"سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔ کیا آپ دو فون بھی مجھے اُدھار نہیں کرنے دیں گے؟"

"نہیں۔ اُدھار ہمارے ہاں ہرگز نہیں کیا جاتا۔"

"تب پھر بتایئے۔ ہم کیا کریں؟ کہاں جائیں؟"

"میں کیا بتا سکتا ہوں۔ آپ یتیم خانے میں چلے جائیں۔"

"یتیم خانہ۔ کیا مطلب؟"

"شہر میں ایک عدد یتیم خانہ موجود ہے۔ بس صرف وہاں آپ کو پناہ ملے گی۔ اور کہیں نہیں۔ وہاں بھی۔" وُہ کہتے کہتے رک گیا۔

"وہاں بھی کیا؟"

"آپ کو گھنٹوں کام کرنا پڑے گا۔ تب کہیں جا کر ایک ایک روٹی ملے گی۔"

"گویا وُہ یتیم خانہ ہوا۔ خرکار کیمپ ہو گیا۔"

"لیکن وہ حسنہ کار کیمپ بھی اس شہر میں بہت غنیمت ہے۔ آپ جیسے لوگ صبر شکر کرکے وہاں چلے جاتے ہیں۔" کلرک نے کہا۔

"اس سے کہیں یہ بہتر ہے کہ ہم پیدل چلتے ہوئے اس شہر سے نکل جائیں۔" خان رحمان جل بھن کر بولے۔

"ضرور۔ ایسا کر لیں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

اور وہ ہوٹل جانباز سے باہر نکل آئے —

"اُف مالک — یہ سب کیا ہے۔" شہناز بیگم بولیں۔

"گھبراؤ نہیں بیگم۔ بس کسی طرح ایک فون کرنے کی مہلت مل جائے، پھر دیکھ لیں گے ان لوگوں کو۔" خان رحمان نے پُر سکون انداز میں کہا۔

وہ چلتے رہے۔ چلتے رہے۔ یہاں تک کہ شہر کی ایک غریب آبادی تک پہنچ گئے —

"کیوں نہ ان میں سے کسی گھر میں پناہ لے لی جائے — پناہ دینے والا شاید فون کرا دے گا۔" حامد نے مشورہ دیا۔

"مشورہ ٹھیک ہے۔" سرور بولا۔

"کوشش کر لیں۔" ناز نے کہا۔

اور خان رحمان نے ایک دروازے پر دستک دے ڈالی۔ جلد ہی دروازہ کھلا —

دوسرا لمحہ حیران کن تھا۔ یہ وہی راہ گیر تھا۔ جو ان کا پرس لے اڑا تھا اور جس سے انھوں نے بہت سی باتیں کی تھیں —

"اوہ۔ آپ لوگ۔" اس کے منہ سے نکلا، پھر اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دینا چاہا، لیکن انھوں نے پیر اڑا دیا۔ اور دروازے کو دھکا دے کر فوراً اندر داخل ہو گئے۔

"آپ جانتے ہیں۔ آپ نے کتنا سنگین جرم کیا ہے — یہاں کسی کے گھر میں زبردستی داخل ہونے والا فوراً گرفتار کر لیا جاتا ہے۔"

"اور کسی کا پرس اڑانے والا۔"

"جرم کس طرح ثابت کریں گے۔"

"ضرورت کیا ہے۔ جرم ثابت کرنے کی۔" انھوں نے یہ کہتے ہی ایک بھرپور مکا اس کی ٹھوڑی پر دے مارا۔ وہ چیخ مار کر اُلٹ گیا —

"حامد۔ دروازہ بند کر دو۔ ہم اپنا پرس اس سے ضرور حاصل کریں گے، کیوں کہ ہمیں پرس کی بہت ضرورت ہے۔" خان رحمان جلدی سے بولے۔

"جی بہتر۔" اس نے کہا اور فوراً دروازہ بند کر دیا۔ اس کے گرنے کی آواز سُن کر اندر سے آواز اُبھری:

"کیا ہوا مائیکل؟"

یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ جب مائیکل کی طرف سے جواب نہ ملا تو وہ وہاں پہنچ گئی اور حیران ہو کر بولی:

"ہائیں۔ یہ کیا۔ کون ہو تم لوگ؟"

"مائیکل کے دوست۔ یہ ہمیں دیکھ کر مارے خوشی کے بے ہوش ہو گیا:" خان رحمان خوش ہو کر بولے۔

"مارے خوشی کے بے ہوش؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! کیوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"آج سے پہلے تو ہوا نہیں۔"

"ہوش میں آنے پر مسٹر مائیکل آپ کو بتا دیں گے۔ اب انھیں بستر پر لٹا دینا چاہیے۔"

"ہاں ٹھیک ہے:" وہ بولی۔

"مسٹر مائیکل نے آج ایک بڑا ہاتھ مارا ہے۔ اس نے رقم کہاں رکھی ہے؟" خان رحمان مسکرائے۔

"کیا مطلب؟" وہ چونک اٹھی۔

"اس نے سرخ رنگ کا پرس ایک اجنبی کی جیب سے نکالا ہے۔ اس میں تقریباً دس ہزار روپے تھے:"

"ن۔ نہیں تو۔"

"تو کیا تم بھی بے ہوش ہونا چاہتی ہو؟" خان رحمان

نے اسے گھورا۔

"کیا۔ تب۔ تو یہ۔ خوشی کے مارے بے ہوش نہیں ہوئے۔"

"ارے نہیں۔ ان کے سر پر میں نے ایک ہاتھ رسید کر دیا تھا۔ کہو تو ایک ہاتھ تمھاری طرف بھی ہو جائے:"

"خبردار۔ میں چیخ کر سارے محلے کو جمع کر لوں گی۔"

"اچھا! یہ بات ہے۔ تو پھر یہ لو۔"

انھوں نے بلا کی رفتار سے آگے بڑھ کر اس کی کن پٹی پر بھی ایک ہاتھ رسید کر دیا۔ وہ تڑ سے گری اور بے ہوش ہو گئی۔

"اب ہم اطمینان سے اپنا پرس تلاش کر سکیں گے:" خان رحمان بولے۔

"لیکن ابا جان پہلے ان دونوں کو باندھ دینا چاہیے۔ کہیں یہ ہوش میں آ کر کوئی حرکت نہ کر گزریں:"

"ہاں! ٹھیک ہے:"

گھر سے ایک رسی تلاش کر کے دونوں کو باندھ دیا گیا، اس کے بعد سارے گھر میں پرس کی تلاش شروع ہوئی۔ لیکن پوری کوشش کے باوجود بھی پرس کہیں نہ ملا۔

"حیرت ہے۔ پرس انھوں نے کہاں رکھ دیا:" خان رحمان بڑبڑائے۔

"اب ان دونوں کو ہوش میں لانا پڑے گا۔" حامد بولا۔
ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ آخر تھوڑی دیر بعد مائیکل نے آنکھیں کھول دیں۔

"اچھے دوست مائیکل۔ میرا پرس کہاں ہے؟"

"پرس۔ اوہ۔ وہ یہاں کہاں۔ ایک کار والے نے اسے میرے پاس سے اڑا لیا تھا۔" اس نے سرد آہ بھری۔

"کیا!" خان رحمان چلّائے۔
ان کے رنگ اُڑتے نظر آئے۔

ایک بات

انسپکٹر جمشید دفتر سے نکلے ہی تھے کہ ایک کار ان کے سامنے سے گزری۔ وہ چونک اُٹھے۔ اور فوراً جیپ کا رُخ کار کی طرف موڑ دیا۔ کار زیادہ رفتار پر نہیں تھی۔ اس لیے وہ جلد ہی اس تک پہنچ گئے، لیکن اس جگہ سڑک پر بہت رش تھا۔ اس لیے وہ پُر سکون انداز میں کار کے پیچھے لگے رہے۔ ان کی حیرت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر کم آبادی والے ایک علاقے میں پہنچنے پر وہ جیپ کو آگے نکال لے گئے اور کار کے ڈرائیور کو رکنے کا اشارا کیا۔ کار رک گئی۔ انھوں نے بھی جیپ روک لی اور اس سے نیچے اُتر کر کار کی طرف بڑھے، ڈرائیور سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں بھی حیرت تھی۔

"کیا بات ہے جناب۔ آپ بہت دیر سے میرا تعاقب کر

رہے ہیں۔"

"ہاں! یہ بات ٹھیک ہے۔ آپ کا نام؟"

"کیوں۔ آپ میرا نام کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"پہلے آپ نام بتائیں، پھر میں وجہ بھی عرض کردوں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں ماجد کوتا ہوں۔"

"یہ کار آپ کی ہے؟"

"جی نہیں۔ میں تو صرف ایک ڈرائیور ہوں۔ خان بہادر صاحب کا ملازم۔ یہ کار ان کی ہے۔"

"خان بہادر کون؟"

"آپ نہیں جانتے۔ سرفراز علی خان صاحب۔ جو مشہور رئیس ہیں اور شہر میں خان بہادر کے نام سے مشہور ہیں۔"

"سمجھ گیا۔ آپ کن کی بات کر رہے ہیں۔ تو یہ کار ان کی ہے۔"

"جی ہاں!"

"یہ ان کے پاس کب سے ہے؟"

"جی۔ صرف تین روز سے۔ تین دن پہلے ہی انھوں نے خریدی ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔"

"کیا مطلب!"

"یہ کار میرے عزیز ترین دوست کی ہے۔ اور ان کے مالی حالات بالکل ٹھیک ہیں۔ کاریں بیچنے اور خریدنے کا انھیں کوئی شوق نہیں۔ بلکہ وہ اس کار کو بہت پسند کرتے ہیں اور اسے بہت اچھی طرح رکھتے ہیں۔"

"آپ۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"یہ کہ میں حیران ہوں۔ انھوں نے ایک کار بیچی۔ اور مجھے خبر کیوں نہ کی۔"

"تو جناب۔ یہ بات تو آپ ان سے ہی معلوم کریں۔ میرا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔" اس نے جل کر کہا۔

"افسوس! وہ ان دنوں احسان پور گئے ہوئے ہیں۔ سیر کے لیے۔ اور اسی کار پر گئے تھے۔ جاتے وقت وہ مجھ سے بھی ملے تھے۔ ہم لوگوں کو بھی چلنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن میں اور میرا گھرانہ ان دنوں مصروف تھا۔ اس لیے ان کا ساتھ نہ دے سکا۔ اب میں حیران ہوں کہ احسان پور جا کر ان پر کیا مصیبت ٹوٹی کہ انھیں کار فروخت کرنا پڑی۔ اور اگر کوئی مصیبت ٹوٹ ہی پڑی تھی تو انھوں نے مجھے فون کیوں نہ کیا۔"

"میں پھر کہوں گا۔ آپ کو یہ باتیں اپنے دوست سے پوچھنی چاہییں۔"

"ہاں ! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

انھوں نے جیپ ایک طرف کر لی۔ کار آگے بڑھ گئی۔

پھر انھوں نے جیب سے اکرام کو فون کیا:

"ہیلو اکرام۔ سرفراز علی خان کو جانتے ہو؟"

"جی ہاں! کیوں نہیں۔ بہت مشہور آدمی ہیں۔"

"ان کی نگرانی شروع کرا دو۔"

"جی۔ کیا مطلب؟"

"ان کے پاس خان رحمان کی کار ہے۔ ان کے ڈرائیور کا کہنا ہے کہ کار انھوں نے خرید لی ہے۔ کار کا نمبر تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ایکسیڈنٹ کا شکار ہو جانے والی کسی کار کا نمبر لگایا گیا ہے شاید۔ خان رحمان چار روز پہلے احسان پور گئے تھے۔ اور اسی کار میں گئے تھے۔"

"اوہ! یہ تو بہت حیرت انگیز خبر ہے۔"

"ہاں! اسی لیے میں نے ان کی نگرانی کا فیصلہ کیا ہے اور خود میں احسان پور جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے سر۔ آپ فکر نہ کریں۔ کار اور سرفراز علی خان ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہوں گے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

اب ان کا رُخ گھر کی طرف تھا۔ اور وہ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی محمود بول اُٹھا:

"خیر تو ہے ابّا جان! آج آپ بہت گہری سوچ میں ہیں۔"

"ہاں بھئی۔ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔"

اور پھر انھوں نے تفصیل دہرا دی۔ چاروں بے چین ہو گئے۔

"تب تو ہمیں اسی وقت احسان پور کی طرف چل پڑنا چاہیے۔"

"ہاں! میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔"

ایک گھنٹے بعد انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزانہ کار میں بیٹھے احسان پور کی طرف جا رہے تھے:

"جہاں تک مجھے یاد ہے۔ ہم آج تک احسان پور نہیں گئے۔"

"ہاں! اس دُور دراز شہر کی سیر کا کبھی خیال نہیں آیا، خان رحمان کو نہ جانے کیسے خیال آگیا تھا۔ مشکل یہ ہے کہ وہاں ہوائی اڈہ نہیں ہے۔ ہم کل کسی وقت پہنچیں گے۔ علاقہ پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔"

"انکل نے وہاں پہنچ کر کوئی اطلاع بھی تو نہیں دی"

"اسی بات پر تو مجھے حیرت ہے۔ ویسے میرا خیال ہے وہ خیریت سے نہیں ہیں۔ ورنہ فون ضرور کر دیتے۔" انسپکٹر جمشید بولے اور سوچ میں ڈوب گئے۔

دوسرے دن صبح کے وقت وہ احسان پور کے نزدیک پہنچ گئے۔

"شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہم شہر کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔" انسپکٹر جمشید نے کار روکتے ہوئے کہا۔

"بات تو ٹھیک ہے۔" فاروق بولا۔

صبح کی خنک ہوا چل رہی تھی۔ انھوں نے کار کے دروازے کھول دیے اور پاؤں پھیلا دیے۔ جلد ہی دو کسان ادھر سے گزرے۔

"اے جناب۔ ذرا بات سنیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ وہ چونک کر ان کی طرف بڑھے:

"جی جناب۔ کیا بات ہے؟"

"ہمیں احسان پور جانا ہے۔ ابھی کتنی دور ہے؟"

"دور تو اتنا نہیں ہے، لیکن بہتر ہوگا کہ آپ احسان پور نہ جائیں۔"

"کیوں؟"

"احسان پور کے حالات آج کل عجیب و غریب ہیں۔"

"عجیب و غریب سے آپ کی کیا مراد ہے؟" وہ بولے۔

"وہاں چند ماہ سے عجیب قسم کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے پورا شہر غنڈوں کا اکھاڑا بن گیا ہے۔"

"اور چند ماہ پہلے ایسا نہیں تھا؟"

"جی نہیں۔"

"آپ کو یہ خبر کیسے لگی۔ جب کہ کسی اخبار میں ایسی کوئی خبر نہیں چھپی۔"

"جو لوگ ایسا کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ شاید بہت لمبے ہیں۔ وہ شہر کی خبروں کو ادھر ادھر پھیلنے نہیں دیتے۔ کسی دوسرے شہر کا آدمی اگر شہر میں آجائے تو اسے واپس جانے کے قابل نہیں چھوڑتے۔"

"کیا مطلب؟" انھوں نے بوکھلا کر کہا۔

"جی۔ میں مطلب نہیں بتا سکتا۔ کیوں بھئی۔ تم کیا کہتے ہو؟" اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے جناب۔ ہم مطلب نہیں بتا سکتے، پتا نہیں ایسا کس طرح ہوتا ہے۔ یہ تو بس اڑتی پڑتی خبریں ہیں۔ جن کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر۔ ہو سکتا ہے، یہ صرف

اڑا لیں ہوں۔"

"ہوں ۔ کاریں وغیرہ تو نہیں چرا لی جاتیں ؟"

"کاریں ۔ کیا ۔ وہاں تو سُنا ہے ، سب کچھ چرا لیا جاتا ہے"

"شکریہ ! آپ نے ہمیں بہت قیمتی معلومات مہیا کی ہیں ۔"
انسپکٹر جمشید بولے ۔

دونوں کسان آگے بڑھ گئے ۔

"اب کیا پروگرام ہے ؟" انسپکٹر جمشید نے ان کی طرف دیکھا

"صاف ظاہر ہے ۔ انکل خان رحمان یہاں پھنس چکے ہیں ۔
ان کی تلاش کے علاوہ اور ہم کیا کر سکتے ہیں ۔"

"ہوں ٹھیک ہے ۔ آؤ چلیں ، لیکن بھئی ! ہم اپنی کار چوری
نہیں ہونے دیں گے ۔" انھوں نے مُسکرا کر کہا ۔

"جیسے آپ کی مرضی ۔" جواب میں فاروق بھی مُسکرایا ۔

وُہ شہر کی طرف چل پڑے ۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید کو
اچانک نہ جانے کیا ہوا ، انھوں نے تیزی سے کار واپس موڑی
اور اس طرف بڑھے جس طرف کسان گئے تھے ۔ جلد ہی
انھوں نے ان دونوں کو جا لیا اور کار ان کے آگے لے جا کر
کھڑی کر دی ۔ بہت سی گرد ان دونوں کسانوں پر جا پڑی ۔
وُہ گرد میں اٹ کر رہ گئے ۔

"اوہو ۔ کیا مصیبت ہے ۔"

"تم لوگ تو کسان ہو ۔ مٹی سے کیوں گھبرا رہے ہو ۔" انسپکٹر
جمشید مسکرائے ۔

"اوہو ۔ یہ آپ ہیں ۔ کیا کوئی اور بات پوچھنی ہے ۔"

"ہاں ! ایک بات ۔" وُہ بولے ۔

"فرمائیے ۔ کیا بات ہے ؟"

"میرا پرس کہاں ہے ؟"

"پپ ۔ پرس ۔ کیا مطلب ۔"

محمود ، فاروق اور فرزانہ بھی زور سے چونکے تھے ۔

"کیسا پرس جناب ! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ۔" دُوسرے نے
جھلا کر کہا ۔

"تم نے رخصت ہوتے وقت مجھ سے بہت گرم جوشی سے ہاتھ
ملایا تھا ۔ اس قدر زیادہ گرم جوشی سے کہ تم لڑکھڑا بھی گئے تھے ،
لیکن اب میں سوچ رہا ہوں ۔ وُہ لڑکھڑاہٹ مصنوعی تھی ۔ تم
جان بوجھ کر لڑکھڑائے تھے ۔ اس لیے میرا پرس تمھاری جیب
میں ہی ہو سکتا ہے ۔"

"لیکن ابا جان ۔ آپ نے تو جیب میں ہاتھ ڈال کر نہیں
دیکھا ۔ خیال غلط بھی تو ہو سکتا ہے ۔" فرزانہ نے حیران ہو
کر کہا ۔

"نہیں ۔ میرا خیال غلط نہیں ہو سکتا ۔ جس طرف یہ لوگ

جا رہے ہیں۔ اس طرف کوئی کھیت نہیں ہیں۔ میں راستے میں آنکھیں بند نہیں رکھا کرتا۔ کھیت تو اس طرف ہیں جس طرف ہم جا رہے ہیں۔ گویا یہ ہماری کار دیکھ کر ہی آگے بڑھے تھے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"آپ کا خیال غلط ہے جناب۔ ہم چور نہیں ہیں۔ ہم نے تو آپ کو چوروں کے بارے میں اطلاع دی ہے۔"

"ہاں! میں جانتا ہوں۔ لیکن پرس ضرور تمھارے پاس ہے۔ اگر نہ ہوا تو میں معافی مانگ لوں گا۔"

"تو آپ اپنی جیب میں کیوں نہیں دیکھ لیتے ابا جان۔" فاروق بولا۔

"نہیں! پہلے یہ اپنی تلاشی دیں گے۔" انھوں نے کہا۔

"بہت بہتر! ہم اپنی جیبیں الٹ دیتے ہیں۔" ایک نے کہا اور دونوں کے ہاتھ جیبوں کی طرف بڑھے۔

"ایک منٹ۔ ایسے نہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب؟" دونوں نے حیران ہو کر کہا۔

"تم دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ تلاشی ہم خود لیں گے۔"

"آپ لوگوں کا ضرور دماغ چل گیا ہے۔"

"ہو سکتا ہے یہی بات ہو، لیکن اب تمھارا بھی چلا کر

رہیں گے۔" فاروق بولا۔

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دوڑ لگا دی۔ محمود، فاروق اور فرزانہ حیران رہ گئے۔

"ارے ارے۔ یہ کیا بھئی۔ یوں تم کب تک دوڑو گے۔" انسپکٹر جمشید نے ہنس کر کہا اور کار ان کے پیچھے لگا دی۔

دونوں کچھ دیر تو دوڑتے رہے۔ پھر اچانک مڑے۔ اسی وقت کار نے ایک زبردست لہریا کھایا۔ دو فائر ایک ساتھ ہوئے اور گولیاں کار کے پاس سے گزر گئیں۔ انسپکٹر جمشید اگر کار کو نہ لہراتے تو گولیاں شیشے کو توڑ کر ان تک پہنچ گئی تھیں۔

"اوہو۔ یہ لوگ تو اس حد تک پہنچ گئے۔ اب ان کا انتظام کرنا ہی پڑے گا۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے بھی جیب سے پستول نکال لیا، اس وقت تک وہ دوبارہ پوزیشن لے چکے تھے، لیکن اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتے۔ انسپکٹر جمشید نے دو عدد فائر جھونک دیے۔ پستول ان کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ اور وہ ہاتھوں کو پکڑ کر بیٹھ گئے۔

اب وہ کار سے نیچے اتر آئے۔

"اب کیا پروگرام ہے دوستو۔"

"آپ — آپ کون ہیں — آپ تو ہمارے بھی استاد نکلے" ان میں سے ایک نے تکلیف دہ لہجے میں کہا۔ دونوں کے ہاتھوں سے خون بہ رہا تھا۔

"تو تم — کسان نہیں ہو؟"

"نہیں۔" دونوں بولے۔

"تب پھر کون ہو؟"

"اس کے غلام — جو پورے شہر پر حکومت کر رہا ہے۔"

"وہ کون ہے؟"

"کسی کو بھی نہیں معلوم۔"

"خیر — چکر کیا ہے؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اس — اس کے پاس۔" ان میں سے ایک کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"کہو کہو۔" انھوں نے جلدی سے کہا۔

"اس کے پاس ہمارے تمام جرائم کے ثبوت موجود ہیں — وہ جس وقت چاہے — وہ ثبوت پولیس کے حوالے کر سکتا ہے۔"

"ہوں! آگے کہو۔"

"اب ہم اس کے غلام ہیں — اس نے ہماری ڈیوٹی یہ لگا رکھی ہے کہ جو کار والا بھی شہر میں داخل ہو — اسے شہر کے بارے میں عجیب و غریب داستان سنائی جائے — یہ کہ

شہر غنڈوں کا شہر ہے — اچکوں کا شہر ہے — پولیس بھی غنڈوں کے ساتھ مل گئی ہے — وہ بھی ان کے خلاف رپورٹ درج نہیں کرتی ہے — سارا شہر گویا اچکوں کا شہر بن گیا ہے۔"

"تو کیا — شہر میں ایسے حالات ہیں نہیں؟"

"جی نہیں — بالکل نہیں، لیکن جس کار والے کو ہم یہ خبریں سنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں — اسے شہر میں ایسے ہی حالات نظر آتے ہیں — شہر میں داخل ہوتے ہی اس کی کار اڑا لی جاتی ہے — کیوں کہ ہم اور ہم جیسے کچھ اور اسے پہلے ہی اطلاع دے دیتے ہیں — اس نے ہمیں وائرلیس سیٹ دے رکھے ہیں۔"

"اوہ!"

"اس کا پیغام مل جاتا ہے — فلاں جگہ پہنچ جاؤ — وہاں تمہارے لیے فلاں چیز ملے گی — فلاں جگہ پہنچ جاؤ — وہاں کام کرنا ہوگا — وغیرہ۔"

"ہوں — میں سمجھ گیا — اور تم لوگ اس شہر میں کب سے سرگرم عمل ہو؟"

"چھ ماہ تو ضرور ہو گئے ہیں — ہمیں چھ ماہ پہلے ہی وہ ثبوت ڈاک کے لفافے میں ملے تھے — اور ساتھ ہی یہ حکم بھی ملا تھا کہ فوراً احسان پور پہنچ جائیں — ورنہ ثبوت دارالحکومت کی

پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا"

"اس طرح اس نے اس شہر میں غنڈے جمع کر لیے" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی ہاں! اور وارداتیں شروع ہو گئیں"۔

"لیکن۔ تم نے تو شہر سے باہر ہی واردات کر ڈالی"۔

"ہمیں یہ بھی ہدایت ہے۔ تاکہ کار والا جب شہر میں داخل ہو تو اس کی پریشانیاں پہلے ہی شروع ہو چکی ہوں اور اسے سکھ کا سانس نہ مل سکے"۔

"ہوں! شہری حدود سے باہر تمہارے علاوہ اور کتنے لوگ یہ کام کر رہے ہیں"۔

"ہمارے علاوہ دو آدمی اور ہیں۔ وہ ہم سے کافی آگے موجود رہتے ہیں"۔

"گویا۔ ابھی ہمیں وہ بھی روکیں گے"۔ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی نہیں۔ ہم انہیں وائرلیس پر بتا چکے ہیں"۔

"تم نے بہت آسانی سے یہ باتیں بتا دیں۔ حیرت ہے"۔

"ہم اس کے ہاتھوں تنگ بھی تو بہت ہیں"۔

"کیوں! کیا وہ خاطر خواہ معاوضہ نہیں دیتا؟"

"بالکل دیتا ہے، لیکن جس وقت چاہے۔ ہمیں قانون کے حوالے بھی کر سکتا ہے۔ ہم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ

سکتے۔"

"لوٹی ہوئی رقم تم لوگ اسے کس طرح پہنچاتے ہو؟"

"وائرلیس کے ذریعے ہدایات مل جاتی ہیں کہ فلاں جگہ رقم پہنچانی ہے۔ ہر روز جگہ تبدیل کر دی جاتی ہے"۔

"اس کا مطلب ہے۔ وہ بہت چالاک ہے۔ خیر۔ کیا تم ہمارے بارے میں اسے اطلاع دے چکے ہو"۔

"جی ہاں۔ بالکل!"

"خیر۔ کیا تم چاہتے ہو۔ اس سے تم لوگوں کا پیچھا چھوٹ جائے"۔

"اس سے بڑھ کر ہم کچھ نہیں چاہتے"۔

"ٹھیک۔ تب پھر۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے"۔

"جی۔ وہ کیا؟"

"ہمارا ساتھ دو"۔

"آپ۔ آپ کون ہیں؟"

"یہ نہ پوچھو۔ بس اس گفتگو کے بارے میں اسے کوئی علم نہیں ہونا چاہیے"۔

"ٹھیک ہے۔ نہیں ہو گا"۔

"گڈ۔ اب تم ایک دوسرے کے ہاتھوں پر پٹیاں باندھ دو۔ ہم چلتے ہیں۔ اگر تم نے اس ساری بات چیت اور جو

کچھ یہاں ہوا۔ اس کی خبر اس نامعلوم شخص کو دی تو پھر ہم تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ اس بات کا خیال رہے۔"

"فکر نہ کریں۔" ایک نے کہا۔

وہ کار موڑنے ہی لگے تھے کہ دوسرا بولا:

"اور اپنا پرس تو بھول ہی رہے ہیں آپ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے پرس نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔

"میں بھول نہیں رہا تھا۔ بلکہ دیکھ رہا تھا۔ تم خود پرس لوٹاتے ہو یا نہیں۔"

"چلیے۔ اس امتحان میں تو ہم کامیاب ہو گئے۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ شہر میں تم سے کس جگہ ملاقات ہو سکتی ہے۔"

"ہماری یہاں سے ڈیوٹی سورج غروب ہونے کے بعد ختم ہوتی ہے۔ یہاں سے کپڑے تبدیل کر کے سیدھے ہوٹل جانباز جاتے ہیں۔ وہاں کھانا وانا کھاتے ہیں۔ اور پھر اپنے کوارٹر میں جا کر سو جاتے ہیں۔"

"جانباز ہوٹل ہی کیوں؟"

"وہاں ہمیں پیسے نہیں دینا پڑتے۔ بس اپنے کارڈ دکھانے پڑتے ہیں۔"

"اوہ۔ تو کیا اس نامعلوم آدمی کا ان سے حساب چلتا ہے۔"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"کارڈ ذرا مجھے بھی دکھاؤ۔"

دونوں نے سنہری رنگ کے دو کارڈ نکال کر دکھا دیے۔ ان پر صرف ہوٹل جانباز لکھا تھا۔

"یہ کیا۔ یہ تو ہوٹل جانباز کے اپنے کارڈ ہیں۔"

"جی ہاں! یہ ہمیں باس سے ہی ملے ہوئے ہیں۔"

"تین دن پہلے جو رولز رائس اڑائی گئی تھی۔ اس کے مسافروں کا کیا بنا؟" انسپکٹر جمشید نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"کار سے پہلے ہی ان کا پرس اڑا لیا گیا تھا۔ لہٰذا وہ ہوٹل میں رہائش بھی اختیار نہ کر سکے۔ اتفاق سے وہ ہمارے اس ساتھی کے گھر پناہ لینے پہنچ گئے۔ جس نے ان کا پرس اڑایا تھا۔ وہاں انھوں نے اسے مارا پیٹا، لیکن باس کے آدمی پہلے ہی ان لوگوں کے تعاقب میں تھے۔ باس کے آدمی آئے اور ان لوگوں کو پکڑ کر لے گئے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا، پھر انسپکٹر جمشید بے چینی کے عالم میں بولے:

"اور اب وہ کہاں ہیں؟"

"باس کو ہی معلوم ہے۔"

"ہوں خیر۔" انھوں نے کہا۔

اب وہ شہر کی طرف چل پڑے۔

"تمام حالات ہم جان چکے ہیں۔ اب ہمیں باس تک پہنچنا ہے۔ خان رحمان کے بارے میں اس سے ہی معلوم ہو سکے گا۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"ہوں! لیکن سوال تو یہ ہے کہ باس تک کس طرح پہنچیں؟"

"اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی کار اڑانے کا انھیں موقع دیں اور خود کسی ٹیکسی میں تعاقب کریں۔" فرزانہ نے پُر جوش انداز میں کہا۔

"ہوں! ترکیب بُری نہیں۔ اس پر عمل کریں گے۔"

"ایسا نہ ہو۔ کچھ ٹیکسی ڈرائیور بھی اس کے لیے کام کر رہے ہوں۔" فاروق نے خدشہ ظاہر کیا۔

"اوہ ہاں! اس کا بھی امکان ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تب پھر۔"

"پروا نہ کرو۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ہمیں ہر حال میں خان رحمان کو تلاش کرنا ہو گا۔"

تھوڑی دیر بعد وہ شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ جدید طرز پر بنائے گئے اس شہر کو دیکھ کر وہ حیران رہ

گئے۔ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پہاڑوں میں گھرا یہ چھوٹا سا شہر اتنا خوب صورت اور پُر فضا ہو گا۔ جلد ہی وہ ہوٹل جانباز کے نزدیک پہنچ گئے:

"محمود، فاروق، فرزانہ۔ تم تینوں پہلے ہی ایک ایک ٹیکسی پکڑ لو۔ میں ہوٹل کے سامنے کار روک کر اندر جاؤں گا اور کمرے کے لیے بات کروں گا۔"

"جی۔ اکٹھی تین ٹیکسیاں۔"

"ہاں! اگر ہماری کار اڑائی جائے تو اسے روکنے کی بجائے تعاقب شروع کیا جائے گا۔ میرا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر ہم بچھڑ جائیں تو پولیس اسٹیشن پہنچیں گے۔" انھوں نے کہا۔

"جی بہتر!" تینوں ایک ساتھ بولے اور نیچے اُتر گئے، سڑک بہت مصروف تھی اور ہر طرف ٹیکسیاں نظر آ رہی تھیں، لہٰذا انھوں نے ایک ایک ٹیکسی پکڑ لی۔ اس وقت تک انسپکٹر جمشید کار پارک کر چکے تھے اور اب ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

کاؤنٹر پر پہنچ کر انھوں نے کہا:

"ایک ڈبل روم چاہیے۔ ایک ہفتے کے لیے۔"

"آپ اکیس ہزار روپے دے دیں۔" کلرک نے جلدی سے

کہا۔

"اکیس ہزار روپے۔" ان کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

"ہاں! یہی ریٹ ہے ہمارا۔ ویسے میرا جی چاہے تو اس سے زیادہ بھی لے سکتا ہوں۔"

"خیر۔" انھوں نے کندھے اچکائے اور پرس میں سے چیک بک نکال کر چیک لکھنے لگے۔

"نہیں جناب۔ چیک نہیں چلے گا۔"

"اس شہر کا چیک بھی نہیں چلے گا؟" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب۔ چیک اسی شہر کے بنک کا ہے؟" کلرک نے حیران ہو کر کہا۔

"اس میں حیرت کی کیا بات؟" وہ بولے۔

"میں سمجھا تھا۔ آپ کہیں باہر سے آئے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ میں دارالحکومت سے آرہا ہوں۔ اور آنے سے پہلے کافی رقم یہاں اپنے بنک کی شاخ میں منتقل کروا چکا ہوں۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"اوہ ہاں۔ واقعی۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔"

اس نے جلدی سے کہا، پھر بولا:

"لیکن جناب۔ ہم پہلے بنک سے تصدیق کریں گے۔"

"شاید اس شہر میں ایمان دار لوگ نہیں بستے۔" انسپکٹر جمشید سرد آواز میں بولے۔

"جی وہ۔ کیا کہا جائے۔ مجبوری ہے۔"

"فون آپ کے سامنے رکھا ہے۔ تصدیق کر لیں۔"

اس نے فوراً بنک کے نمبر ملائے اور پھر چیک کا اکاؤنٹ نمبر دیکھ کر بولا:

"ہیلو۔ اس نمبر کا آج کی تاریخ کا اکیس ہزار روپے کا چیک وصول کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟"

دوسری طرف کا جواب سن کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور بولا:

"ٹھیک ہے جناب۔ تیسری منزل کا بارھواں کمرہ آپ کے لیے بک کر دیا گیا ہے۔ یہ رہی چابی۔"

"میری کار باہر کھڑی ہے۔ اس میں سے سامان نکلوا کر اوپر بھجوا دیں۔" یہ کہ کر وہ مڑنے لگے۔

"ایک منٹ جناب۔ آپ نے کیا فرمایا۔ آپ کی کار باہر کھڑی ہے؟"

"ہاں کیوں۔ میں ابھی ابھی تو کھڑی کر کے آیا ہوں۔"

وہ بولے۔

"مہربانی فرما کر پہلے باہر جا کر ایک نظر ڈال لیں۔ کار وہاں موجود ہے یا نہیں۔"

"کیوں۔ کیا بات ہے؟"

"یہاں پارکوں میں کار کوئی رہنے نہیں دیتا۔ ورنہ اس وقت آپ کو پارک خالی نہ ملتا۔ چھ ماہ پہلے تو کاروں کے لیے جگہ نہیں بچا کرتی تھی۔" اس نے کہا۔

"اوہو اچھا۔ یہ بات ہے۔"

"ہاں۔ یہاں کے حالات یہی ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔"

انسپکٹر جمشید نے کہا اور دروازے کی طرف آئے۔ باہر نظر ڈالی۔ دل ہی دل میں مسکرائے اور پھر واپس کاؤنٹر پر پہنچے:

"آپ کا خیال ٹھیک نکلا۔ باہر واقعی کار نہیں ہے۔ خیر میں خود ہی اپنے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔ سامان بھیج دیں۔"

"آپ۔ آپ پریشان نہیں ہوئے۔"

"کس سلسلے میں؟" انھوں نے حیران ہو کر کہا۔

"کار اور سامان کے چوری ہو جانے پر۔"

"ارے نہیں۔ یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ اس دنیا میں سب سے قیمتی چیز انسانی جان ہوتی ہے۔ میں تو وہ ہر وقت داؤ پر لگائے رکھتا ہوں۔"

عین اسی وقت کسی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

کار غائب

جوں ہی ان کے والد اندر گئے۔ تین آدمی بجلی کی سی سرعت کے ساتھ کار کی طرف بڑھے۔ ایک کے ہاتھ میں چابی تھی۔ اس نے کار کو چابی لگائی۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور اس کے دونوں ساتھی پچھلی سیٹ پر۔ پہلے نے اسی چابی سے انجن سٹارٹ کیا اور کار ہوا ہو گئی۔

اس کار کو دیکھ رہے ہیں آپ؟ محمود نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

"میری آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں۔"

"یہ اچھی بات ہے۔ اس کے پیچھے چلیں۔"

"پیچھے کیوں چلوں؟" اس نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"اس لیے کہ وہ ہماری کار ہے۔ اور تین کار چور اسے چرائے لیے جا رہے ہیں۔"

"سوری۔ میں ایسے چکروں میں نہیں پڑتا۔"

"اچھا۔ یہ بات ہے۔ تمہاری گردن میں کوئی چیز اسی لمحے چبھنا شروع ہوئی ہے۔ محسوس کیا ہے یا نہیں۔"

"کیا مطلب؟" اس نے بھنا کر کہا۔

"یہ ایک عدد پستول کی نالی ہے۔"

"ہوگی۔ مجھے کیا۔"

"تو تم اس کی زبان بھی نہیں سمجھتے۔"

"یہ میری ٹیکسی ہے۔ میری مرضی۔ میں جاؤں یا نہ جاؤں، تم نیچے اتر جاؤ۔"

"افسوس۔ کار نظروں سے اوجھل ہونے والی ہے۔ خیر تم بھی کیا یاد کرو گے۔"

دوسرے ہی لمحے اس کا پستول والا ہاتھ بلند ہوا۔ پستول پوری قوت سے اس کے سر پر لگا۔ اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ محمود فوراً حرکت میں آیا۔ اسی وقت فاروق اور فرزانہ اسی ٹیکسی میں داخل ہو گئے۔ ادھر محمود ڈرائیور کو ساتھ والی سیٹ پر دھکیل چکا تھا۔ اور ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھال چکا تھا۔ اب ٹیکسی اس سمت میں اڑی جا رہی تھی۔

"تو تمہارے والے ٹیکسی ڈرائیوروں نے بھی جانے سے انکار

کر دیا تھا؟"

"ہاں! یا تو یہ لوگ بھی اس پُر اسرار شخص کے غلام ہیں۔ یا پھر اس سے خوف زدہ ہیں۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ ہم تم پر پوری طرح نظر رکھے ہوئے تھے۔ تمہیں ناکام ہوتے دیکھتے تو خود بھی اپنے والے ٹیکسی ڈرائیوروں کے ساتھ یہی سلوک کرتے۔" فاروق بولا۔

"مشکل یہ ہے۔ وہ کم بخت کار کو بہت تیز لے جا رہے ہیں۔ اور ہمیں سڑکوں سے واقفیت نہیں۔"

"پروا نہیں ۔ بس تم اس کے پیچھے لگے رہو۔" فرزانہ نے کہا۔

اسی وقت وہ ایک چوک سے گزرے۔ ٹریفک سارجنٹ نے انھیں رُکنے کا اشارا کیا۔ شاید رفتار بہت تیز تھی، لیکن وہ بھلا کہاں رک سکتے تھے۔ یہ دیکھ کر سارجنٹ نے موٹر سائیکل ان کے پیچھے لگا دی۔

"چلو۔ یہ اچھا ہے۔ ایک مددگار مل گیا۔" فاروق خوش ہو گیا۔

"مددگار۔ نہیں۔ دشمن۔ یہ بھی ہمارا راستا روکنے کی کوشش کرے گا۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"ہم سے آگے کئی تیز رفتار کاریں گئی ہیں، ان کاروں کو تو اس نے روکنے کی کوشش کی نہیں۔ روکنے کے لیے اسے ہم ہی کیوں نظر آئے۔ صاف ظاہر ہے۔ کار چرانے والے اسے اشارا کر کے گزرے ہیں۔"

"ارے نہیں۔ اس کا امکان نہیں۔" محمود مسکرایا۔

"خیر۔ پتا چل جاتا ہے۔"

تعاقب جاری رہا۔ یہاں تک کہ کار شہر سے باہر نکل گئی، سارجنٹ برابر ان کے پیچھے تھا، لیکن محمود رفتار پر پوری طرح قابو پائے ہوئے تھا اور ابھی تک اس نے موٹر سائیکل کو آگے نہیں نکلنے دیا تھا۔ سارجنٹ کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہو چلے تھے۔

اور پھر کار یک لخت ایک طرف مُڑ گئی۔ محمود کے لیے بریک لگانا مشکل ہو گیا۔ لہٰذا وہ آگے نکل گیا۔ آگے جا کر رکا۔ اور مُڑا ہی تھا کہ موٹر سائیکل سامنے آ گئی۔

محمود اس وقت طیش میں آ گیا۔ اس نے ٹیکسی کی رفتار ایک دم تیز کر دی۔ سارجنٹ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے فوراً موٹر سائیکل کو ایک لہریا دیا اور سڑک سے اتار لے گیا۔ محمود نے فوراً ٹیکسی اس سمت میں موڑ دی۔ جس سمت میں کار گئی تھی۔ اب پھر سارجنٹ ان

کے پیچھے تھا۔ پانچ منٹ بعد ان کی کار ایک پرانے کھنڈر کے پاس کھڑی نظر آئی، لیکن اس میں کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

محمود نے بھی ٹیکسی اس کے پاس لے جا کر روک دی۔ ساتھ ہی موٹر سائیکل آ رکی۔

"تو تم یہاں مجھ سے معاملہ طے کرو گے۔ تم نے تو مجھے کچل ہی دیا تھا۔ نکالو دو ہزار روپے۔ اس سے کم پر بات نہیں ہو گی۔"

"آپ کو کچل ہی دینا چاہیے تھا۔" محمود نے جل بھن کر کہا۔

"کیا بک رہے ہو۔ ارے یہ کیا۔ ٹیکسی میں تو ایک بے ہوش آدمی موجود ہے۔ اوہو۔ اس کے سر سے تو خون بہ رہا ہے۔ خوب۔ تو تم اس کی ٹیکسی اڑائے لیے جا رہے تھے۔" سارجنٹ بولا۔

"ارے نہیں میاں۔ عقل کے ناخن لو۔ اس کار کو دیکھ رہے ہو۔"

"ہاں کیوں نہیں۔"

"یہ دراصل ہماری ہے۔ اور تین آدمی اسے چرا کر لے آئے ہیں۔ ہم ان تین چوروں کا تعاقب کرنا چاہتے تھے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے تعاقب کرنے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا اسے بے ہوش کرنا پڑ گیا۔"

"اوہ، لیکن یہاں تو کوئی بھی نظر نہیں آ رہا۔"

"اس میں ہمارا کیا قصور جناب۔ آپ کی عینک کون سے نمبر کی ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"کیا مطلب؟" اس نے جھنا کر کہا۔

"کار تو آپ کو نظر آ رہی ہے نا۔ وہ اس کھنڈر میں کہیں چھپ گئے ہوں گے، کیوں کہ انھوں نے ہمارے ساتھ آپ کو بھی دیکھ لیا ہے۔ آپ ساتھ نہ آ جاتے تو شاید وہ چھپنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ لہٰذا ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔" محمود جلدی جلدی بولا۔

"شکر گزار ہیں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں! شکریہ ادا کرنا اتنی بڑی بات تو نہیں۔"

"نن۔ نہیں۔" وہ بولا۔

"ارے بھئی۔ آپ لوگ کہاں چھپ گئے ہیں۔ سامنے آ کر بات کر لیں۔ ورنہ ہم اپنی کار لے جائیں گے، پھر نہ کہنا۔" فاروق نے بلند آواز میں کہا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا۔ وہ تو ہم ویسے بھی لے جائیں گے۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"ہاں ٹھیک ہے ۔ کار تو ہم ویسے بھی لے جائیں گے ۔ تم
سے جو ہو سکتا ہے کر لو۔" فاروق نے پھر بلند آواز نکالی۔

ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا ۔

"نہیں جناب ۔ شاید وہ بزدل بھاگ نکلے ۔ اب آپ کیا کہتے
ہیں:" محمود سارجنٹ کی طرف مڑا۔

"تم لوگوں کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ کار آپ کی ہے"

"کاغذات اس میں موجود ہیں۔"

"اوہ اچھا ۔" سارجنٹ بولا ۔ اور کار کی طرف بڑھا ۔ اس نے
کار کا خانہ کھولنے کی کوشش کی ، لیکن خانہ نہ کھلا ۔

"یہ کیا ۔ اس کا خانہ تو جام ہے۔"

"جام نہیں ہے جناب ۔ کام ہے۔" فاروق بولا۔

"کام ہے ۔ کیا مطلب؟" وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"یعنی اس پر کچھ کام کیا گیا ہے ۔ اسے صرف ہم کھول
سکتے ہیں۔"

"اور یہ بھی ثبوت ہو گا اس بات کا کہ کار ہماری اپنی
ہے۔"

"ہاں ! یہ تو ہے۔" وہ بولا۔

"چلیے ۔ آپ نے ہماری ایک بات تو مانی۔" محمود بولا اور
آگے بڑھ کر خانہ کھول دیا۔

سارجنٹ کاغذات چیک کرنے لگا ، پھر اس کے منہ سے
نکلا :

"انسپکٹر جمشید ۔ یہ کار تو انسپکٹر جمشید کی ہے ۔ اور تم انسپکٹر
جمشید ہرگز نہیں ہو۔"

"اس میں کوئی شک نہیں جناب کہ ہم انسپکٹر جمشید نہیں
ہیں ۔ ہم تینوں تو خیر بیک وقت ہو بھی نہیں سکتے ۔ ہاں
ہمارے ابا جان ضرور ہیں۔"

"یہ کون سے انسپکٹر جمشید ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"آپ کتنے انسپکٹر جمشید سے واقف ہیں؟"

"م ۔ میں تو ایک سے بھی واقف نہیں ہوں۔" اس نے
گڑبڑا کر کہا۔

"تب پھر آپ نے یہ کیوں پوچھا ۔ یہ کون سے انسپکٹر
جمشید ہیں۔"

"انسپکٹر کئی محکموں میں ہوتے ہیں۔" اس نے منہ بنایا۔

"اوہ ہاں ! یہ بات بھی ٹھیک ہے ۔ خیر ۔ ان کا تعلق
محکمہ سراغ رسانی سے ہے۔"

"اوہو ۔ اچھا۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"اور چونکہ ہماری کار چرائی جا رہی تھی ، اس لیے ہم
ٹیکسی تیز چلانے پر مجبور تھے۔"

"اور ٹیکسی ڈرائیور کو زخمی کرنے پر بھی مجبور تھے؟" اس نے بھنّا کر کہا۔

"ہاں! اس مجبوری کو اس نے خود دعوت دی تھی۔" محمود نے فوراً کہا۔

"لو فرزانہ۔ اب مجبوری کو بھی دعوت دی جانے لگی۔ ہو گئی اس کی تو عیش۔" فاروق چہکا۔

"فرزانہ؟" سارجنٹ نے حیران ہو کر کہا۔

"کیوں! اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ کیا ان کا نام فرزانہ نہیں ہو سکتا۔" فاروق بولا۔

"ہونے کو اس دُنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"کیا کہا؟" وہ بولا۔

"کک۔ کچھ نہیں۔"

"کک۔ کہیں تم لوگ محمود، فاروق اور فرزانہ تو نہیں ہو، یعنی مشہور و معروف انسپکٹر جمشید کے بچے۔" سارجنٹ نے جلدی سے کہا۔

"ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ میں کسی انسپکٹر جمشید سے واقف نہیں ہوں۔"

"اس وقت تم لوگوں کو ٹٹول رہا تھا۔"

"ارے باپ رے۔ ہم نے تو محسوس نہیں کیا۔ آپ نے آخر کس طرح ٹٹولا تھا۔"

"میں سمجھ گیا۔ آپ لوگ ضرور وُہی ہیں۔"

"اچھا۔ اگر سمجھ ہی گئے ہیں تو یہ بتائیے۔ اب کیا پروگرام ہے؟"

"پہلے تو ہم ان لوگوں کو تلاش کریں۔ جو کار اڑا کر لائے ہیں۔ پھر سب کے سب پولیس اسٹیشن چلیں گے۔ ڈی ایس پی صاحب ہی فیصلہ کریں گے۔ ویسے انسپکٹر جمشید صاحب اس وقت کہاں ہیں؟"

"وہ ہمیں ہوٹل جانباز کے باہر کھڑا کر کے اندر گئے تھے، تاکہ کمرہ بُک کرا سکیں۔"

"اور انھوں نے آپ کو باہر کیوں کھڑا کیا تھا؟" اس نے کہا۔

"آپ تو وکیلوں کی طرح جرح کر رہے ہیں۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں ہماری کار نہ چرا لی جائے۔"

"ہوں! آئیے۔ کھنڈر کو دیکھیں۔"

"اور اگر انھوں نے اندر سے فائرنگ شروع کر دی۔" محمود نے منہ بنایا۔

"تب پھر۔ کیا کیا جائے۔"

"ہمیں چار طرف سے کھنڈر کی جانب بڑھنا چاہیے۔ وہ بھی پوزیشن لے کر۔"

"ہوں! بات تو ٹھیک ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ ایسے معاملات کے ماہر ہیں آپ لوگ۔" اس نے تعریف کی۔

"اگر ماہر نہ ہوتے تو ہمارے نام آپ تک کس طرح پہنچتے۔"

"ہوں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ خیر چلیے۔"

وہ سینے کے بل لیٹ کر آگے رینگنے لگے۔ یہاں تک کہ بالکل نزدیک پہنچ گئے۔ اسی وقت سارجنٹ نے بلند آواز میں کہا:

"تم لوگ کہاں ہو۔ باہر نکل آؤ۔ ورنہ ہم فائرنگ شروع کر دیں گے۔ خبردار۔ ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے سامنے آنا۔"

اس کی بات کا کسی نے جواب نہ دیا۔ سارجنٹ پستول پہلے ہی ہاتھ میں لے چکا تھا۔ اس نے ایک ہوائی فائر کر دیا۔ اور کچھ اور آگے بڑھا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ بھی الگ الگ سمت سے آگے بڑھتے کھنڈر کی دیوار تک آ پہنچے تھے۔ انھوں نے بھی ایک ایک فائر کر دیا۔ اس پر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ آخر سارجنٹ نے چلا کر کہا:

"خبردار۔ میں دستی بم پھینکنے لگا ہوں۔ تمھیں صرف ایک

منٹ کی مہلت ہے۔"

ایک منٹ بھی گزر گیا۔ سارجنٹ نے پریشان ہو کر ادھر اُدھر دیکھا:

"اب کیا کریں؟" اس کی آواز اُبھری۔

"بم پھینکیں۔ اور کیا کریں گے۔" فرزانہ مسکرا کر بولی۔

"بم میرے پاس کہاں؟" وہ ہنسا۔

"تو پھر جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ایسے جھوٹ تو ہم روزانہ نہ جانے کتنے بولتے ہیں۔"

"لیکن یہ بہر حال جھوٹ ہیں۔ اور گناہ کبیرہ ہیں۔"

"آپ لوگ جاسوس ہیں یا مولوی؟"

"دینی علم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی مولوی بن جاتا ہے۔"

"اب کیا کرنا ہے؟"

"ہم ان کھنڈرات کو اندر سے دیکھیں گے۔"

"اور اگر وہ کہیں چھپے ہوئے ہوں۔ تو؟"

"کوئی پروا نہیں۔ ہمیں ان کھنڈرات کی تلاشی لینا ہی پڑے گی۔"

"جب کہ ضرورت کوئی نہیں۔ وہ کار تو نہیں لے جا سکے نا۔"

"انھوں نے کار چرانے کا جرم تو کیا ہے۔" محمود نے بھی

اسی کے انداز میں کہا۔

"ہوں! ٹھیک ہے۔ چلیے پھر آگے" اس نے کندھے اچکائے۔

"آپ اگر خوف محسوس کر رہے ہیں تو باہر ہی ٹھہرے رہیں"

"م — میں محسوس تو کر رہا ہوں"

"تب پھر ہمیں کوئی اعتراض نہیں" محمود نے کہا۔

اب تینوں ایک ہی جگہ جمع ہو گئے اور پھر بے دھڑک اندر کی طرف چلے۔ کھنڈر کسی محل کا تھا اور بہت لمبا چوڑا تھا۔ اس کی بہت سی دیواریں درست حالت میں بھی تھیں — لیکن کوئی کمرہ مکمل طور پر درست حالت میں نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھتے چلے گئے — پندرہ منٹ میں انھوں نے پورا کھنڈر دیکھ ڈالا، لیکن کار چرانے والوں کا کوئی پتا نہ چلا۔ آخر وہ تھک ہار کر واپس آ گئے:

"کیوں نہیں ملے؟" سارجنٹ بولا۔

"جی نہیں۔ شاید وہ کھنڈر میں داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل گئے۔ اور یہ صرف آپ کی وجہ سے ہوا" محمود نے منہ بنایا —

"میری وجہ سے کیوں؟" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"انھوں نے آپ کو دیکھ کر فرار ہونے کا پروگرام بنا لیا

ہو گا" محمود مسکرایا۔

"خیر — اب کیا کیا جا سکتا ہے"

"ٹھیک ہے — ہم واپس چلتے ہیں۔ پہلے تو ٹیکسی ڈرائیور کو ہوش میں لانا ہو گا، تاکہ وہ اپنی ٹیکسی لے جا سکے — اور ہم اپنی کار کو لے جائیں"

"اچھا خیر — یوں ہی سہی — ویسے کیا یہ بہتر نہیں رہے گا کہ آپ لوگ پہلے میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلیں۔ اور یہ ڈرائیور بھی"

"اگر آپ ہمیں پولیس اسٹیشن ضرور لے جانا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے — ورنہ ضرورت تو کوئی ہے نہیں"

"نہیں — جانا ضروری ہے"

"ہوں ٹھیک ہے — چلیے"

ٹیکسی ڈرائیور کو ہوش میں لانے کی تدبیر کی گئی — آخر اس نے آنکھیں کھول دیں:

"م — میں کہاں ہوں؟"

"اس — اس کھنڈر کے سامنے" فاروق اسی کے انداز میں بولا۔ ڈرائیور نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر گھبرا کر بولا:

"تت — تم — تم — تم تو وہی ہو" اب اس کا اشارہ محمود کی طرف تھا —

"جی ہاں! آپ کا یہ اندازہ تو خیر بالکل ٹھیک ہے، ہوں تو میں وہی۔"

"اور۔ اور تم نے مجھ پر وار کیا تھا؟"

"اس لیے کہ کار چور ہماری کار چرائے لیے جا رہے تھے، اور آپ ان کا تعاقب کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میں نے مجبوراً ایسا نہیں۔" محمود نے کندھے اچکائے۔

"ہم۔ اوہ۔ آپ کون ہیں؟" اس کی نظریں سارجنٹ پر پڑیں۔

"یہ ٹریفک سارجنٹ ہیں۔ وردی نہیں دیکھ رہے آپ ان کی۔"

"اوہ ہاں۔ باپ رے۔ کیا آپ چالان کریں گے؟"

"ٹیکسی بہت تیز جا رہی تھی۔ میرے اشارے پر بھی روکی نہیں گئی تو مجھے تعاقب میں نکلنا پڑا، لیکن ان لوگوں کو بھی مجبوری تھی۔ آؤ چلیں۔"

وہ واپس روانہ ہوئے۔ سارجنٹ کے پیچھے چلتے آخر پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئے۔ اندر ایک انسپکٹر بیٹھا تھا۔ اس کی مونچھیں بہت بڑی اور خوفناک قسم کی تھیں۔

"کیا بات ہے سارجنٹ۔ کن لوگوں کو پکڑ لائے ہو۔ کیا کیا ہے انھوں نے؟"

"ابھی بتاتا ہوں سر۔"

وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد سارجنٹ نے اسے ساری کہانی سنائی۔ انسپکٹر جمشید کا نام سن کر انسپکٹر زور سے چونکا:

"اوہو۔ یہ لوگ ہمارے شہر میں ہیں، پھر تو آ گیا مزا۔"

"جی۔ آ گیا مزا۔ وہ کہیں گیا ہوا تھا کیا؟" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"اوہو۔ ہو۔" وہ عجیب انداز میں ہنسا۔

"یہ۔ آپ کی ہنسی ہے یا۔" فاروق نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

"ہاں ہاں۔ ہنسی ہی ہے۔ فکر نہ کرو۔" انسپکٹر بولا۔

"اب ان کا کیا کرنا ہے سر؟" سارجنٹ نے کہا۔

"ٹیکسی ڈرائیور کو جانے دو۔ جاؤ بھئی۔ مرہم پٹی کرا کے اپنے گھر آرام کرو۔ سارجنٹ آپ بھی جائیں۔ میں ان لوگوں سے چند باتیں کروں گا اور پھر یہ جہاں چاہیں، جا سکیں گے۔"

"شکریہ سر۔" سارجنٹ بولا۔

ڈرائیور اور وہ چلے گئے۔ اس کے بعد انسپکٹر ان سے مخاطب ہوا:

"انسپکٹر صاحب کہاں ہیں؟"
اس کا انداز راز دارانہ تھا۔ ساتھ ہی اس نے اِدھر اُدھر بھی دیکھا تھا۔ جیسے کوئی اس کی بات تو سُن نہیں رہا۔

"پپ۔ پتا نہیں۔"

"پتا کیوں نہیں۔ کیا آپ لوگ ساتھ نہیں آئے؟"

"آئے ضرور ساتھ ہیں، لیکن آنے کے بعد بچھڑ گئے ہیں، ویسے میرا خیال ہے۔ وہ اس وقت ہوٹل جانباز میں ہیں۔"

"کیا کہا۔ ہوٹل جانباز۔ ارے باپ رے۔" وہ بوکھلا اُٹھا۔

"کیوں۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟"

"ہوٹل جانباز۔ یہی نام لیا ہے نا آپ نے۔" وہ بے یقینی کے عالم میں بولا۔

"ہاں بالکل!"

"تب میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔ وہ اس وقت ہوٹل جانباز میں نہیں ملیں گے۔"

"کیوں جناب! ایسی کیا بات ہو گئی۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"ہوٹل جانباز تو خالص اس پُر اسرار آدمی کا ہے۔" اس نے بتایا۔

"کیا مطلب۔ خالص اس پُر اسرار آدمی کا ہے۔ کس پُر اسرار آدمی کا؟"

"وُہی۔ جس نے اس پورے شہر پر ایک طرح سے قبضہ کر رکھا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے۔ وُہ آدمی جو کاریں چوری کرا لیتا ہے۔ لوگوں کو لوٹ لیتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے اس شہر کا ہر چھوٹا آدمی بڑے سے خوف زدہ ہے۔ ہر بڑا چھوٹے کو دبائے ڈال رہا ہے۔" محمود جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔

"ہاں! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو آپ اس ہوٹل کو بند کیوں نہیں کر دیتے۔"

"افسوس! یہ اس قدر آسان نہیں۔"

"کس قدر آسان۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"اسے بند کرنے کے لیے اس کے خلاف کوئی ثبوت بھی تو ہونا چاہیے۔"

"ہاں! یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" محمود نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اور آپ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ہمارے ابا جان وہاں نہیں ملیں گے۔"

"ہاں بالکل!"

"تب پھر پہلے ہمیں وہاں جانے دیں۔ تاکہ معلوم ہو۔ ابا جان وہاں ہیں یا نہیں۔ یا پھر کہاں ہیں۔ ان کو لے کر ہم یہاں آئیں گے اور آپ سے تفصیلی بات کریں گے، پھر دیکھیے گا۔ ہم اس پُر اسرار آدمی کا کیسا بُرا حال کرتے ہیں۔"

"لیکن کیسے۔ اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ وہ کون ہے۔"

"پہلے ہم یہی معلوم کریں گے۔ حال بُرا بعد میں کرتے رہیں گے۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

"اچھی بات ہے۔ آپ لوگ جا کر دیکھ لیں۔ ناکام رہنے کی صورت میں یہیں آ جائیے گا۔"

"بہت بہتر۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہم نے ناکام رہنا نہیں سیکھا۔"

"آپ نہیں جانتے۔ وہ بھی بہت خوف ناک چیز ہے۔"

"ہم اس کی ناک کاٹ دیں گے۔ خوف خود بخود ختم ہو جائے گا۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر بولا۔

"اس کی باتوں کا مطلب ذرا مشکل سے سمجھ میں آتا ہے جناب۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"کیا تم لوگوں کو بھی۔" انسپکٹر نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"جی ہاں! ہم بھی آخر اسی دُنیا کے انسان ہیں۔ ویسے ابھی شاید ہم نے آپ کا نام نہیں پوچھا۔"

"میرا نام۔ میرا نام رومان بھائی ہے۔"

"رومان بھائی۔ واہ۔ خوب نام ہے۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

"تو جناب رومان بھائی۔ آپ ہم لوگوں کا بس انتظار کریں، ہم انھیں لے کر آتے ہیں۔"

"فکر نہ کرو۔ میں شوق سے انتظار کروں گا۔" وہ مسکرایا۔

تینوں پولیس اسٹیشن سے باہر نکلے اور پھر دھک سے رہ گئے۔ ان کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ جلدی سے پھر پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئے۔

"ارے! آپ تو واقعی بہت ہی جلدی واپس آ گئے۔ لیکن۔ انسپکٹر صاحب کہاں ہیں۔ تت۔ تو۔ وہ نہیں ملے ہوٹل جانباز میں۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا۔"

"او ہو۔ انسپکٹر صاحب۔ آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ آپ کو کس نے۔۔۔" محمود کہتے کہتے رُک گیا۔

"کیا کہنا چاہتے ہیں؟"
"کک - کچھ نہیں۔"
"بات صرف اتنی ہے انسپکٹر صاحب - کار غائب ہے۔"
"کیا!!!" رومان بھائی اچھل پڑا -

ایک کشتی کے مسافر

انسپکٹر جمشید چونک کر مڑے - لمبے قد کا ایک آدمی ان کی طرف مسکرا کر دیکھ رہا تھا:

"میں ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا - جو دوسروں کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ رکھ دیں۔"

"اوہ سوری۔" وہ چونکا اور ہاتھ کندھے پر سے اٹھا لیا -

"فرمایئے - میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"آپ کو کسی کی تلاش ہے شاید۔" اس نے کہا۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔"

"میں اس سلسلے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔"

"اوہو اچھا - یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

"تو پھر آیئے میرے ساتھ۔" اس نے پھر بے تکلفی سے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہال کی طرف کھینچنے لگا، پھر چونک

کر بولا:

"اوہ معاف کیجیے گا۔ مجھے کچھ عادت سی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔"

وہ اس کے ساتھ چلتے ہال کی ایک میز پر جا بیٹھے:

"ہاں! اب فرمائیے۔ آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

"خان رحمان کی تلاش میں ہیں نا آپ؟"

"یہ ٹھیک ہے۔" انھوں نے چونکے بغیر کہا۔

"آپ کو میری بات سن کر حیرت نہیں ہوئی۔" وہ حیران رہ گیا۔

"جی نہیں۔ بالکل حیرت نہیں ہوئی۔"

"لیکن کیوں۔ میرا تو خیال تھا، آپ یہ جملہ سن کر چونک پڑیں گے۔"

"یہ ضروری نہیں کہ آدمی کا ہر خیال درست ثابت ہو۔"

"ہوں! آپ کی بات ٹھیک ہے۔ تو کیا آپ نہیں جاننا چاہتے۔ آپ کے دوست کہاں ہیں۔"

"یہ جاننے کے لیے تو بُری طرح بے چین ہوں۔"

"اور حیران نہیں ہوئے۔"

"نہیں۔ اس لیے کہ جس شخص نے ان کی کار چرائی ہے، وہ یہ بات جانتا ہے کہ اس نے کس نام کے آدمی کی کار

چرائی ہے۔"

"لیکن۔ وہ یہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ آپ ان کی تلاش میں ہیں۔"

"یہ بھی کوئی مشکل نہیں۔ یہ بات کوئی ایسا شخص کہہ سکتا ہے جو خان رحمان کو بھی جانتا ہو اور مجھے بھی۔ اور ہم دونوں کے آپس کے تعلقات سے خوب واقف بھی ہو۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ میں تمھیں بھی جانتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے شوخ لہجے میں کہا۔

"کیا!" وہ اچھل پڑا، آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

"چلے تھے مجھے حیران کرنے اور حیران خود رہ گئے۔ ہے نا کمال۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"واقعی۔ ماننا پڑے گا۔"

"سنو! تم اکرم بوگرہ ہو۔ ایک مشہور چور۔ پہلے دارالحکومت میں وارداتیں کرتے رہے ہو۔ تمھیں سزا ہو گئی تھی۔ سزا کے بعد وہاں نظر نہیں آئے۔ شاید اس لیے کہ ادھر آ گئے تھے۔ تم نے مجھے وہاں اکثر دیکھا ہو گا اور میرے ساتھ خان رحمان کو بھی دیکھا ہو گا۔"

"ہوں! آپ نے ٹھیک کہا۔"

"تو پھر بتاؤ۔ خان رحمان کہاں ہیں۔"

"کار ان کی میں نے چرائی تھی۔ نقدی ہوٹل میں داخل ہونے سے پہلے ہی چرا لی گئی تھی۔ اس لیے وہ ہوٹل میں کمرہ بھی کرائے پر نہ لے سکے۔ یہاں سے وہ کسی پناہ کی تلاش میں نکلے اور اتفاق سے اس گھر میں جا پہنچے۔ جس میں ان کی نقدی چرانے والا رہتا تھا۔ وہ ان سے ٹکرا گئے۔ انھیں باندھ لینے میں کامیاب ہو گئے۔"

"پھر۔" انسپکٹر جمشید بے چین ہو گئے۔

"لیکن۔ باس کے گرگے ان کے تعاقب میں تھے، کیوں کہ میں پہلی ہی نظر میں انھیں پہچان چکا تھا۔"

"اور تم نے باس کو یہ اطلاع دی تھی کہ اس بار تم نے کس کی کار چرائی ہے۔ وہ کون ہے۔"

"ہاں! لہٰذا باس کے گرگوں نے خان رحمان اور ان کے بیوی بچوں کو قابو میں کر لیا۔"

"ہوں! سوال یہ ہے کہ تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"

"اس لیے کہ باس کا حکم یہی ہے۔" وہ مسکرایا۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید زور سے چونکے۔

"باس آپ سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس نے میری یہ ڈیوٹی لگائی تھی کہ میں آپ سے ملاقات کروں۔ ورنہ میرے

تو فرشتے بھی آپ کے سامنے نہ آتے۔"

"میں سمجھ گیا۔" انسپکٹر جمشید سرد آواز میں بولے۔

"کیا سمجھ گئے آپ؟" اس نے کہا۔

"یہ کہ تمھارے باس نے مجھے دھمکی دی ہے۔ میں اس شہر سے چلا جاؤں۔ یہاں کے معاملات میں دخل نہ دوں۔"

"ہاں! آپ کا یہ اندازہ درست ہے۔ میں حیران ہوں۔ آپ اندازے لگانے میں اس قدر ماہر کس طرح ہیں۔" اس نے کہا۔

"دن رات یہی کام کرتا ہوں۔ اب میرا جواب سنو۔ میں اپنے دوست کو لے کر ہی یہاں سے جاؤں گا۔"

"باس کا کہنا ہے۔ اگر آپ نے تین گھنٹے کے اندر اندر شہر نہ چھوڑا تو آپ کے دوست اور ان کے بچوں کو ختم کر دیا جائے گا۔"

"ہوں! تمھارا باس ایک بات نہیں جانتا، لیکن وہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے پُر سکون آواز میں کہا۔

"کون سی بات؟" وہ بولا۔

"یہ کہ زندگی اور موت کا مالک صرف اور صرف اللہ ہے۔"

"کیا مطلب۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ یہاں سے نہیں جائیں گے۔"

"ضرور جاؤں گا، لیکن اپنے دوست کو لے کر۔"

"لیکن اگر تین گھنٹے کے اندر آپ یہاں سے نہ نکل گئے تو باس آپ کے دوست کو ختم کر دے گا۔"

"سنو اکرم بوگرہ۔ تمہارا باس بہت ہی بزدل ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"وہ کیسے؟" اکرم بوگرہ نے حیران ہو کر کہا۔

"وہ میری یہاں آمد سے خوف زدہ ہو گیا ہے۔ اور بس۔"

"شش۔ شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن باس بزدل ہرگز نہیں ہے۔"

"جو خوف زدہ ہو جائے۔ وہ بہادر نہیں ہو سکتا۔"

"خیر۔ آپ کی مرضی۔ میں باس کو اطلاع کر دیتا ہوں۔"

"اب یہ معاملہ اتنا آسان نہیں رہا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب؟"

"تم اس وقت میرے پستول کی زد پر ہو۔ اٹھو اور یہاں سے باہر چلو۔ میں پہلے تم سے دو دو باتیں کروں گا۔ اس کے بعد تمہارے باس سے۔"

"میں باس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکوں گا۔ اس کے

بارے میں تو کوئی بھی کچھ نہیں جانتا۔"

"تب۔ تم اس کو اطلاع کس طرح دو گے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"وائرلیس سیٹ کے ذریعے۔"

"ہوں! ٹھیک ہے۔ میری موجودگی میں ہی اطلاع دے دینا۔ اب اٹھو۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن پھر تیورا کر گر گئے۔

دو لمبے تڑنگے غنڈوں نے پیچھے سے ان پر اچانک وار کیا تھا۔ انسپکٹر جمشید ان کی آمد کو اس لیے محسوس نہ کر سکے کہ وہ ایک ہوٹل کا ہال تھا۔ وہاں بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ باس کے آدمی پبلک مقام پر بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں۔

دونوں کے ہاتھوں پر فولادی دستانے تھے۔ دونوں ہاتھ ایک ساتھ ان کے سر پر پورے زور سے لگے۔ اور وہ بے ہوش ہو گئے۔

"اسے بھی وہیں پہنچا دو۔ جہاں اس کا دوست موجود ہے۔" اکرم بوگرہ نے مسکرا کر کہا۔

وہ دونوں جھک کر انہیں اٹھانے لگے۔

★

"جی ہاں! کار واقعی غائب ہو چکی ہے۔ افسوس! ہم میں سے ایک کو باہر ٹھہرنا چاہیے تھا۔" محمود بولا۔

"یہ۔ یہ بہت بُرا ہوا۔" رومان بھائی بولا۔

"خیر۔ کوئی بات نہیں۔ کار تو ہمیں انکل خان رحمان کی بھی تلاش کرنا ہے۔ اپنی بھی تلاش کر لیں گے۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل جانباز چلے جاتے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔" رومان بھائی نے کہا۔

وہ باہر نکلے۔ جلد ہی ٹیکسی مل گئی۔

"جانباز ہوٹل۔" محمود نے کہا۔

"وہاں جا کر کیا کریں گے۔ کہیں اور چلے جائیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ آپ ٹیکسی ڈرائیور ہیں یا نصیحت خان۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"نصیحت خان زیادہ اور ٹیکسی ڈرائیور کم۔"

"آخر ہم ہوٹل جانباز کیوں نہ جائیں؟"

"وہ جگہ شریفوں کے لیے نہیں ہے۔"

"تو ہم آپ کو شریف نظر آ رہے ہیں۔"

"ہاں بالکل! اس میں کیا شک ہے۔"

"خیر۔ بہت بہت شکریہ، لیکن بات دراصل یہ ہے کہ ہم وہاں جانے پر مجبور ہیں۔ وہاں ہمارے والد صاحب موجود ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔" اس نے کندھے اچکائے اور ٹیکسی چل پڑی۔

ہوٹل جانباز کے سامنے وہ ٹیکسی سے اُترے۔ بل لیتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور بولا:

"میں باہر ہی موجود رہوں گا۔ کہیں آپ لوگوں کو پھر میری ضرورت نہ پڑ جائے۔"

"اوہ! آپ تو واقعی ایک بہت اچھے ٹیکسی ڈرائیور ہیں۔"

"یہ بات نہیں۔" وہ بولا۔

"کیا مطلب۔ آپ اچھے ٹیکسی ڈرائیور نہیں ہیں؟"

"ہوں گا، لیکن پہلے نہیں تھا۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پہلے آپ اچھے ٹیکسی ڈرائیور نہیں تھے۔ اب بن گئے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"نہیں! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پہلے میں ٹیکسی ڈرائیور تھا ہی نہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"میری کہانی ذرا لمبی ہے۔"

"اب ہمیں یہ لمبی کہانی سننا ہی پڑے گی - آپ باہر ہی ٹھہریں - ہم جلد ہی لوٹ آئیں گے۔"

"بہتر یہ تھا کہ آپ پہلے میری کہانی سن لیتے۔"

انھوں نے اس کی طرف دیکھا اور حیران رہ گئے - اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب چکی تھیں -

"اوہو - آپ تو دکھی معلوم ہوتے ہیں - خیر - آؤ بھئی - ٹیکسی میں بیٹھ کر ان کی کہانی سن لیں۔" محمود نے کہا۔

"ہاں - لیکن ہم تو پہلے ہی ابا جان کی طرف سے بہت فکر مند ہیں۔"

"اللہ مالک ہے۔"

تینوں پھر ٹیکسی میں بیٹھ گئے -

"ہاں ! اب سنائیں اپنی کہانی۔"

"میں اور میرا بڑا بھائی - روئی کے تاجر تھے - بھائی جان نے احسان پور کی سیر کا پروگرام بنایا - اور بس وہ اس دن کے بعد واپس نہیں آیا - میں ان کی تلاش میں نکلا، لیکن ایک غریب آدمی کا روپ دھار کر - اور پھر اسی شہر کا ہو کر رہ گیا -"

"جی - کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ نہ بھائی کا سراغ ملا ، نہ میں یہاں سے

گیا - ٹیکسیوں کی ایک ایجنسی سے یہ ٹیکسی لے کر چلانے لگا اور کرائے پر ایک مکان لے لیا - یا تو بھائی کا سراغ ملے گا اور میں انھیں لے کر اپنے شہر جاؤں گا - ورنہ یہیں ختم ہو جاؤں گا انھیں تلاش کرتے کرتے - مجھے اپنے بھائی سے بہت محبت ہے۔"

"اور آپ لوگوں کے بیوی بچے ؟"

"ابھی تو ہم دونوں کی ہی شادیاں نہیں ہوئیں - میں ماں سے وعدہ کر کے آیا تھا - اس کے بیٹے کو ضرور واپس لے کر آؤں گا۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا ، پھر محمود نے کہا :

"تب ہم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔"

"کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ ہم بھی یہاں اپنے انکل کی تلاش میں آئے ہیں۔"

"ابھی تو اپنے والد صاحب کی بات کر رہے تھے ؟"

"ابا جان سمیت ہم ان کی تلاش میں آئے تھے - کار کی چوری کے چکر میں الگ الگ ہو گئے - وہ یہاں رہ گئے تھے۔" محمود بولا -

"اوہ۔ تو آپ کی بھی کار چوری ہو گئی ہے۔"

"تو کیا آپ کے بھائی کی کار بھی چرائی گئی تھی؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"ہاں! حالات یہی کر رہے ہیں، کیوں کہ شہر میں ان کی کار کا کہیں بھی پتا نہیں چلا۔ انسپکٹر رومان بھائی ان کا اور کار کا کوئی سراغ نہیں لگا سکے۔ وہ تو ایک بہت ہی سیدھے سادے سے انسپکٹر ہیں۔ شاید ایک معمولی سی چوری کا سراغ بھی نہیں لگا سکتے۔"

"ہاں! ہم نے بھی یہی محسوس کیا ہے۔" محمود بولا۔

"خیر۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کب گم ہوئے تھے؟"

"تین ماہ ہو چلے ہیں۔"

"اوہ۔ تین ماہ۔" فرزانہ نے فکر مند ہو کر کہا۔

"کیوں۔ کیا ہوا؟" ڈرائیور چونکا۔

"نہیں۔ کچھ نہیں۔" فرزانہ جلدی سے بولی۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" فاروق نے پوچھا۔

"جمال پاشا۔"

"اور آپ کے بھائی کا نام؟"

"میرے بھائی کا نام انعام پاشا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم بھی اسی قسم کے حالات کا شکار ہیں۔ اور اب ساتھ ہی کام کریں گے۔ آپ یہیں ٹھہر کر ہمارا انتظار کریں، ہم ذرا اندر ہو آئیں۔"

"میں انتظار کروں گا۔" جمال پاشا نے کہا۔

تینوں ٹیکسی سے اُتر کر ہوٹل جانباز کی طرف بڑھے اور سیدھے کاؤنٹر پر جا کر رُکے:

"انسپکٹر جمشید کون سے کمرے میں ٹھہرے ہیں؟"

"میں دیکھ کر بتاتا ہوں۔" کلرک بولا اور رجسٹر دیکھنے لگا، پھر بند کرتے ہوئے اس نے کہا:

"تیسری منزل کمرہ نمبر بارہ۔ لیکن وہ اس وقت اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔"

"کمرے میں نہیں ہیں۔ کہاں گئے ہیں؟"

"بتا کر نہیں گئے۔"

"تو پھر آپ ہمیں کمرے کی چابی دے دیں۔"

"بھلا میں چابی کس طرح دے سکتا ہوں؟"

"اس لیے کہ ہم ان کے بچے ہیں۔"

"کچھ بھی ہو۔ جب تک وہ اس بات کی تصدیق نہ کر دیں، میں چابی نہیں دے سکتا۔"

"ہوں! ٹھیک ہے۔ اچھا آپ فون کر کے معلوم کر لیں۔

شاید وہ واپس آ چکے ہوں۔"

"نہیں آئے — میں جانتا ہوں۔" اس نے فوراً کہا۔

"آپ اتنے یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہیں؟" محمود نے چونک کر کہا۔

"اس لیے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو گئے ہیں۔"

"ہوں! خیر — ہم ان کا انتظار کر سکتے ہیں؟"

"ضرور — کیوں نہیں — ہال میں تشریف رکھیں اور جتنی دیر چاہے، انتظار کریں۔"

"آؤ بھئی۔" محمود نے کہا۔

وہ ہال کی طرف بڑھنے لگے — اور ایک خالی میز کے قریب پہنچ گئے — اچانک فرزانہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں —

"خیر تو ہے فرزانہ؟" محمود چونک اٹھا۔

"نہیں۔" وہ بولی۔

"نہیں — کیا مطلب؟" فاروق نے اسے گھورا۔

"مطلب یہ کہ خیر نظر نہیں آتی۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"ہمیں انتظار کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"پہیلیوں میں باتیں کرنا تمہاری بہت پرانی عادت ہے — اور ہمیں یہ عادت ایک آنکھ نہیں بھاتی۔" محمود نے

جھلا کر کہا۔

"ادھر دیکھو — کاؤنٹر کلرک بار بار کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھ رہا ہے — آخر کیوں؟"

"تو پھر — اس سے کیا — کیا اتنی سی بات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں بیٹھ کر ابا جان کا انتظار فضول ہے۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"نہیں — یہ اندازہ اتنی سی بات سے ہرگز نہیں لگایا جا سکتا — لیکن آخر یہ کاؤنٹر کلرک ہمیں کیوں گھور رہا ہے؟" فرزانہ بولی۔

"یہ بات عجیب ضرور ہے، پریشان کن بھی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب پھر بھی نہیں نکلتا کہ ہم یہاں بیٹھ کر ابا جان کا انتظار نہیں کر سکتے۔" محمود نے جلدی جلدی کہا۔

"تو پھر — میں یہ بات ایک اور طرح سے ثابت کر سکتی ہوں۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"بسم اللہ کرو — وقت کیوں ضائع کر رہی ہو۔"

"ادھر اپنے پاؤں کی طرف دیکھو، لیکن خبردار — کاؤنٹر کلرک یہ بات محسوس نہ کر سکے کہ ہم نیچے دیکھ رہے ہیں۔" فرزانہ نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"کک — کیوں — کیا یہاں نیچے دیکھنا منع ہے۔"

"اوہو۔ تم موقع دیکھتے ہو نا محل۔"

"ہاں ! اس میں تو خیر کوئی شک نہیں۔" فاروق بولا۔ دونوں نے بڑی مہارت سے نیچے دیکھا اور بُری طرح بے چین نظر آنے لگے —

فرش پر انسپکٹر جمشید کا قلم پڑا تھا —

جیل کے جلّاد

ان کی آنکھ کھلی تو ایک تنگ سی کوٹھری میں تھے — کوٹھری میں زیرو کا بلب بھی روشن تھا۔ کوٹھری کے دروازے پر موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ انھوں نے پُرسکون انداز میں اپنے دائیں بائیں دیکھا اور پھر چونک اُٹھے۔ ان کے دائیں طرف بیگم خان رحمان اور حامد سو رہے تھے۔ بائیں طرف خان رحمان ، سرور اور ناز لیٹے تھے۔ وہ پانچوں گہری نیند میں معلوم ہوتے تھے :

"ہائیں خان رحمان۔ یہ تم ہو۔" انھوں نے خان رحمان کو پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ آخر انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ سبھی جاگ چکے تھے —

"یہ۔ یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں جمشید۔ تم اس کوٹھری میں ہم سے ملاقات کرنے آئے ہو۔ یا۔ تم بھی پھنس چکے ہو۔"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"جی۔ کیا مطلب۔ کیا معلوم ہوتا ہے؟" حامد بولا۔

"یہ کہ میں بھی پھنس چکا ہوں۔"

"اور۔ محمود، فاروق اور فرزانہ؟" خان رحمان ہکلائے۔

"وہ ابھی باہر ہیں، لیکن جلد ہی ان لوگوں کے قابو میں آ جائیں گے۔" وہ بولے۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو جمشید۔ میں تو بس یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ کسی نہ کسی طرح تم مدد کے لیے ضرور پہنچ جاؤ گے اور میرا یہ اندازہ درست نکلا۔"

"ہاں! لیکن اس کے بعد اندازہ غلط ہو گیا۔ یعنی میں ان کے قابو میں آ گیا۔ دراصل میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بھرے پُرے ہال میں مجھ پر حملہ کر سکتے ہیں۔"

"اوہ۔ پوری بات سُناؤ جمشید۔"

"پہلے تم سارے حالات سُناؤ۔"

انھوں نے اپنے اپنے حالات سُنائے۔

"گویا ہمیں محمود، فاروق اور فرزانہ کی کامیابی کے لیے دُعا کرنی چاہیے۔" خان رحمان بولے۔

"ہاں ضرور۔ دُعا مومن کے لیے ضروری ہے۔" اُنھوں نے مسکرا کر کہا، پھر جلدی سے بولے:

"اور کوئی نئی بات۔"

"اور یہ کہ یہ مجھ سے چیکوں پر دستخط کرا چکے ہیں۔ گویا میرا بینک بیلنس صاف کرتے جا رہے ہیں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"دو وقت کا کھانا دیتے ہیں۔ چیکوں پر دستخط نہ کروں تو کھانا پینا بند۔"

"ہوں! اب تک کتنے چیکوں پر دستخط کیے ہیں؟"

"دس پر۔"

"اور یہ معلوم نہیں کہ انھوں نے ان میں کتنی رقم بھری ہو گی۔"

"نہیں!" انھوں نے جواب دیا۔

"تب تو یہ تمھیں کنگال کر دیں گے۔"

"خیر۔ کنگال تو نہیں کر سکتے، کیوں کہ میرا اکاؤنٹ صرف ایک بینک میں نہیں ہے۔ کئی اور بینکوں میں بھی ہے۔ اور کئی دُوسرے شہروں میں بھی۔ جب کہ میں یہاں آتے وقت صرف ایک بینک کی چیک بک لایا تھا۔"

"لیکن۔ اس بینک میں بھی نہ جانے کتنی دولت ہو گی۔"

"ہاں! یہ میرا سب سے بڑا اکاؤنٹ ہے۔"

"اچھا اللہ مالک ہے۔ اب ہمیں محمود، فاروق اور فرزانہ کا

انتظار کرنا ہوگا۔ وہ یہاں پہنچے اور ہم۔" وہ کہتے کہتے رُک گئے۔

"رُک کیوں گئے جمشید۔ وہ یہاں پہنچے اور ہم کیا؟" خان رحمان بولے۔

"دروازے کی طرف دیکھ لو۔ میری خاموشی کی وجہ معلوم ہو جائے گی۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

انھوں نے جلدی سے نظریں اٹھائیں۔ وہاں دو خون خوار قسم کے آدمی انھیں کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ ان کے جسم بالکل سیاہ تھے۔ حبشیوں جیسے۔ سیاہ چہروں پر سفید آنکھیں عجیب خوف ناک لگ رہی تھیں۔

"یہ کون ہیں؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اس جیل کے جلاد۔"

"جیل کے جلاد۔"

"ہاں! کسی پر کوڑے برسانا ہوں۔ کسی کو پھانسی دینا ہو تو اس قسم کے فرائض ان کے ذمے ہیں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"تمھارا نام انسپکٹر جمشید ہے؟" ایک جلاد نے سرد آواز میں کہا۔

"ہاں!" وہ بولے۔

"تمھاری کار میں سے ہمیں تمھاری چیک بُک نہیں ملی۔ وہ کہاں ہے؟"

"کار میں۔" انھوں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"کس بات کا مطلب بتاؤں؟" انھوں نے حیران ہو کر کہا۔

"تم نے بتایا ہے کہ چیک بُک کار میں ہے۔ کار میں تو ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔"

"اور کیا تم اس کا خانہ بھی کھول کر دیکھ چکے ہو؟"

"نہیں۔ خانہ ہم سے نہیں کھلا۔ تو کیا چیک بُک بھی اسی میں ہے۔"

"ہاں! دارالحکومت کے بینک کی چیک بُک کار میں ہے۔ اس شہر میں میں نے اپنے بینک کی شاخ میں تھوڑی بہت رقم منتقل کرائی تھی، لیکن اس میں سے اکیس ہزار روپے کا چیک کاٹ کر کاؤنٹر کلرک کو دے چکا ہوں۔"

"ہمیں معلوم ہے۔ اب اس شہر میں آپ کے بینک کی شاخ میں آپ کی زیادہ رقم نہیں ہے۔ تم کار کا خانہ کھولنے کا طریقہ بتاؤ۔"

"افسوس! میں وہ طریقہ تو تمھیں نہیں بتا سکتا۔"

"اس صورت میں ہم تمھارے لیے جلاد ثابت ہوں گے۔"

"تجربہ کر دیکھو" وہ مسکرائے۔

"کیا کر رہے ہو جمشید۔ یہ بہت زیادہ ظالم ہیں۔"

"یہی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہ یہ کہاں تک ظالم ہیں۔ ویسے خان رحمان میرا بھی ایک تجربہ ہے۔"

"کیا؟" خان رحمان بولے۔

"جتنا کوئی زیادہ ظالم ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ وہ بزدل ہوتا ہے۔"

"ہوں! لیکن جمشید۔ یہاں ہم ان لوگوں کے قابو میں ہیں۔"

خان رحمان گھبرا کر بولے۔

"پروا نہیں۔" انھوں نے کندھے اچکائے۔

"جاؤ ٹونڈے۔ روڈا اور اس کے ساتھیوں کو بلا لاؤ۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"اچھا استاد۔ ابھی لایا۔" دوسرے نے کہا اور چلا گیا۔

"ٹونڈا۔ روڈا۔ اور خود تمھارا نام کیا ہے؟" انسپکٹر جمشید نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"ماڑی۔" وہ جھنجھلا کر بولا۔

"بھئی واہ! بہت چن چن کر نام رکھے ہیں۔"

"تھوڑی دیر بعد تم ان ناموں کی مالا جپتے نظر آؤ گے۔"

"نہیں بھئی۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ ہم تو بس اپنے

کی مالا جپتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کچھ زیادہ ہی اکھڑ جان پڑتے ہو۔ خیر۔ دیکھتے ہیں کتنا دم خم ہے۔"

"ضرور دیکھنا۔ دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہو گی۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"جمشید۔ دولت کے لیے کیوں مصیبت مول لیتے ہو۔ بتا دو خانہ کھولنے کا طریقہ۔" خان رحمان بولے۔

"نہیں خان رحمان۔ میں اب ان لوگوں کو اور ظلم نہیں کرنے دوں گا۔"

"اچھا۔ جیسے تمھاری مرضی۔" انھوں نے کندھے اچکائے۔

جلد ہی کوٹھری کے سامنے پانچ غنڈے آ کھڑے ہوئے، چھٹا ان کے ساتھ ٹونڈا تھا، ان پانچ میں سے ایک شخص بالکل گنجا تھا، اس کا سر چمک رہا تھا۔ کوٹھری کے سامنے ایک کھلا میدان تھا، اس میدان کے چاروں طرف کوٹھریاں تھیں، سب کوٹھریوں میں لوگ قید تھے اور اب سب قیدی سلاخوں سے آ لگے تھے۔ شاید ان سب کو معلوم تھا کہ اب کیا تماشا ہونے والا ہے۔

"چلو ٹونڈے۔ اس کوٹھری کا دروازہ کھولو۔" ماڑی بولا۔

"اچھا استاد۔ ابھی لو۔" ٹونڈا خوش ہو کر بولا۔

اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ انسپکٹر جمشید نے بلا کی رفتار سے ایک چھلانگ لگائی اور کوٹھری سے باہر آ رہے، اور بری طرح ٹونڈے سے ٹکرائے۔ وہ اُلٹ کر گرا۔ ساتھ ہی خان رحمان نے باہر چھلانگ لگا دی۔

روڈے نے یہ دیکھ کر انسپکٹر جمشید کی طرف بڑھنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے ایک قلابازی کھائی اور اس کی ٹانگیں انسپکٹر جمشید کے سینے پر لگتی نظر آئیں، لیکن وہ بلا کی پھرتی سے نیچے کو جھک گئے۔ جوں ہی روڈے کی ٹانگیں ان کی کمر پر آئیں۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اسے اپنے اوپر سے اُچھال دیا، وہ دھڑام سے دوسری طرف گرا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس وقت تک انسپکٹر جمشید اس کے باقی ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ خان رحمان نے بھی ایک کی مرمت شروع کر دی۔ انسپکٹر جمشید کے ہاتھ بجلی کی سی سرعت سے جو چلے تو صرف ایک منٹ کے بعد وہ سب کے سب بے لیٹے نظر آئے۔ ماڈی ایک کونے میں کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"کیوں بھئی۔ تم نہیں آؤ گے؟"

"نن۔ نہیں۔ یہ میرا کام نہیں" اس نے کہا۔

"تو پھر اب اپنے باس کو بلا لو۔"

"ہاں، باس کو اطلاع دی جائے گی" اس نے کہا۔

"لیکن میں تمھیں اس قابل کب چھوڑوں گا؟"

یہ کہہ کر وہ اس کی طرف جھپٹے۔ وہ بھڑک کر بھاگا۔ انسپکٹر جمشید نے ایک چھلانگ لگائی اور اس کی ٹانگوں میں ٹانگ اڑا دی۔ وہ منہ کے بل گرا۔ ساتھ ہی اس کے سر پر ایک زبردست ٹھوکر لگی۔ دوسرے ہی لمحے وہ ساکت ہو گیا۔

انسپکٹر جمشید نے فوراً ٹونڈے کی پیٹی میں سے چابیوں کا گچھا نکالا، ایک کوٹھری کی طرف بڑھے اور اس کا تالا کھولنے لگے۔

"یہ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"کیوں۔ کیا ساری زندگی یہیں گزارنے کا پروگرام ہے؟" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"لیکن ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے۔ انھوں نے پورے حفاظتی انتظامات کر رکھے ہیں۔"

"سارے حفاظتی انتظامات تو یہ فرش پر پڑے ہیں" انھوں نے ہنس کر کہا۔

اور پھر باری باری وہ تمام کوٹھریاں کھولتے چلے گئے۔

"آؤ چلیں۔" وہ بولے اور اس طرف قدم اٹھا دیے جس

طرف سے ڈنڈا روڈے اور اس کے ساتھیوں کو لے کر آیا تھا۔

وہ سب سے آگے تھے۔ باقی لوگ ان کے پیچھے سہمے انداز میں چل رہے تھے۔ اب وہ ایک برامدے میں چل رہے تھے۔ جوں ہی برامدے کا موڑ آیا۔ ان کے قدم رک گئے۔ ان کے سامنے لوہے کا ایک جنگلہ تھا۔ موٹی سلاخوں والا۔ اور اس کے دوسری طرف مسلح آدمی موجود تھے۔

"ان سلاخوں کو کس طرح توڑو گے انسپکٹر۔ اور اگر کسی طرح توڑ بھی ڈالو۔ تو ان اسٹین گنوں کا کیا علاج کرو گے۔" برامدے میں گونجنے والی آواز نے ان سب کو ساکت کر دیا۔

"ارے۔ تم لوگوں کو تو سانپ سونگھ گیا۔ آگے بڑھو نا، رک کیوں گئے۔"

"یہ جنگلہ ہٹا دو، پھر دیکھو۔ ہم آگے بڑھتے ہیں یا نہیں۔" انسپکٹر جمشید غرائے۔

"اپنے ساتھیوں کو تو دیکھو۔ کس طرح تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ یہ بے چارے کیا آگے بڑھیں گے۔" ایک اسٹین گن والے نے ہنس کر کہا۔

"یہ آگے نہ بڑھیں۔ میں اور میرا دوست ضرور آگے

بڑھیں گے۔"

"بڑا شوق ہے کیا سینے چھلنی کرانے کا۔"

"نہیں۔ تمہارے سینے چھلنی کرنے کا پروگرام ہے۔"

"شاید خواب دیکھتے رہنے کے عادی ہو انسپکٹر۔ اب تم لوگوں کی بہتری اسی میں ہے کہ خود ہی اپنی اپنی کوٹھری میں بند ہو جاؤ۔ ڈنڈا تالے لگا دے گا۔ صرف اس صورت میں تم لوگوں کو کھانا دیا جائے گا، ورنہ تم بھوکوں مرو گے۔ کیا سمجھے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی ان کے سب ساتھیوں نے کوٹھریوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ انھوں نے مڑ کر دیکھا تو خان رحمان، شہناز بیگم اور تینوں بچے وہیں کھڑے تھے۔

"خان رحمان! تم کیوں رک گئے۔ کیا تم واپس نہیں جاؤ گے۔"

"تم۔ تم کہتے ہو تو چلا جاتا ہوں۔" انھوں نے اداس انداز میں کہا۔

اور پھر وہ بھی تھکے تھکے قدموں سے واپس چل پڑے۔ محافظوں نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ برامدہ اور میدان قہقہے سے گونجنے لگے، پھر جب وہ اپنی کوٹھری تک پہنچے تو قیدیوں نے بھی ان پر ایک قہقہہ لگایا۔ قہقہہ رکنے پر انسپکٹر جمشید

اداس لہجے میں بولے :

"خان رحمان - یہ لوگ کیوں ہنس رہے ہیں - میری کوشش پر - یا اپنی بزدلی پر ؟"

اور ان کے سر شرم سے جھک گئے - انھوں نے کوٹھری میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا - اور پھر ماڈی وغیرہ کے جسموں میں حرکت کے آثار نظر آنے لگے - دروازوں پر تالے لگا دیے گئے -

عین اسی وقت قید خانے میں الارم بج اُٹھا - کان پھاڑ دینے والا الارم —

بادشاہ اور درباری

"یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں ؟" فاروق نے سرگوشی کی -

"ابا جان کا حکم - اور ابا جان ذرا بھی لاپروا نہیں ہیں - یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ان کا حکم گر جائے اور انھیں پتا نہ چلے "
فرزانہ نے کہا -

"تب پھر ؟"

"صاف ظاہر ہے - یہاں ان کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے - لیکن ہم کسی سے اس گڑبڑ کی تفصیل معلوم نہیں کر سکتے - یہ سب لوگ شاید جانباز ہوٹل کے ہی لوگ ہیں - ورنہ یہاں گڑبڑ کے آثار ضرور موجود ہوتے ، لوگ چہ میگوئیاں تو ضرور کر رہے ہوتے "

"ہوں ! بات ٹھیک ہے - تو پھر آؤ - غیر محسوس طور پر یہاں سے نکل چلیں - کہیں ہمارے گرد بھی یہاں کوئی جال نہ بُنا جا رہا ہو " محمود بولا -

وہ اُٹھے اور دروازے کی طرف چل پڑے۔ ساتھ ہی انھوں نے محسوس کیا کہ کاؤنٹر کلرک انھیں اب بھی دیکھ رہا ہے۔ یہ محسوس کر کے محمود کے قدم فوراً کاؤنٹر کی طرف اُٹھ گئے۔

"ہم تھوڑی دیر کے لیے باہر چکر لگا کر آتے ہیں۔ اگر ہمارے آبا جان آئیں تو انھیں ہمارے بارے میں بتا دیجیے گا۔"

"اچھا۔" اس نے کہا۔

وہ اطمینان سے چلتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔ کسی نے انھیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ٹہلتے ہوئے وہ ٹیکسی کے نزدیک پہنچ گئے اور پھر فرزانہ نے ترچھی نظروں سے ہوٹل کی طرف دیکھا۔

"نیچے گر جاؤ۔" وہ چلائی۔

تینوں تڑسے نیچے گرے اور بے آواز پستول کی گولیاں ان کے سروں پر سے گزر گئیں۔ ٹیکسی اور ٹیکسی ڈرائیور بھی بال بال بچے۔

پستول چلانے والے نے ایک ہی بار پستول خالی کر دیا تھا۔ اور یہی بات ان کی خوش قسمتی بن گئی۔ وہ آن کی آن میں ٹیکسی میں لد گئے۔ محمود چلایا:

"نکل چلیے۔"

ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور ہوا ہو گئی۔ انھوں نے اپنے پیچھے دیکھا۔ کوئی پیچھے نہیں آ رہا تھا۔

"کدھر چلوں؟"

"کھنڈر کی طرف۔" فرزانہ نے فوراً کہا۔

"کیوں۔ کھنڈر کی طرف جا کر کیا کریں گے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"کھنڈر سے بہتر پناہ گاہ ہمارے لیے اس شہر میں اور کوئی نہیں ہو سکتی۔" فرزانہ نے کہا۔

"فرزانہ کا خیال ٹھیک ہے۔" محمود نے منہ بنایا۔

"یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ فرزانہ کا خیال ٹھیک نہ ہو۔" فاروق جل کر بولا۔

"چلو پھر۔ تم بتا دو۔ کس طرف چلنا چاہیے۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"آپ لوگ آپس میں لڑنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے۔" جمال پاشا نے گھبرا کر کہا۔

"جی نہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ یہ ہماری پرانی عادت ہے۔"

"کک۔ کون سی؟"

"یہی۔ نوک جھونک کی۔"

"آخر ان لوگوں کا پروگرام کیا تھا؟"

"ہم لوگوں کو ختم کرنا، لیکن غیر محسوس طور پر۔ یہ کوئی نہ کہے کہ جانباز ہوٹل والوں نے مارا ہے۔ ہاں اگر ہم ہوٹل کے اندر ہی رہتے تو پھر ہم آج زندہ نہیں بچ سکتے تھے۔"

"حیرت ہے۔ یہ لوگ کسی سے اس قدر خوف زدہ تو آج تک دکھائی نہیں دیے۔"

"شاید ان کا گرو ہمارے والد صاحب کا پرانا واقف ہے۔"

"ہوں۔ ضرور یہی بات ہے۔" جمال پاشا بولا۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتے رہے، لیکن تعاقب کے آثار نظر نہیں آئے۔

"حیرت ہے۔ اگر ان لوگوں کا پروگرام ہمیں ختم کرنے کا ہی تھا تو پھر۔ انھوں نے تعاقب کیوں نہیں کیا۔"

"اس لیے کہ یہ لوگ صرف اور صرف ہوٹل جانباز کے آس پاس وار کرنا پسند کرتے ہیں۔ تاکہ خود محفوظ رہیں۔ ان کے خلاف کسی قسم کا ثبوت نہ حاصل کیا جا سکے۔"

"اور سارے شہر کا انھوں نے صرف نام بدنام کر رکھا ہے۔"

"ہاں! ہر شکار کو یہی بتاتے ہیں کہ یہ سارا شہر غنڈوں کا شہر ہے۔ حالاں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ شہر بالکل شریفوں کا ہے۔ اگر یہاں سے اس باس کو نکال دیا جائے تو زندگی

پُر سکون ہو جائے۔"

"ان شاء اللہ! ہم اسے نکال کر ہی دم لیں گے۔"

"اس کا امکان تھا، لیکن شاید تمھارے والد صاحب ان لوگوں کے جال میں پھنس گئے ہیں۔"

"فکر نہ کریں۔ ابھی ہم تو آزاد ہیں۔ ہم ان لوگوں کو دیکھ لیں گے۔" محمود مسکرایا۔

ٹیکسی بلا کی رفتار سے چلتی آخر کھنڈر تک پہنچ گئی۔

"آخر ہم کھنڈرات کی طرف کیوں آئے ہیں۔ اس طرف تو ہمارے دشمن بھی آئے تھے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ لیکن انھوں نے ان کھنڈرات کا سہارا لے کر خود کو بچانے کی کوشش کی تھی۔"

"تو کیا ضروری ہے کہ ہم بھی انھی کھنڈرات کا سہارا لیں۔"

"نہیں ضروری نہیں، لیکن ہم یہاں ٹھہر کر کچھ پروگرام تو بنا سکتے ہیں۔" فرزانہ نے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔ یہاں سکون سے بیٹھنے کا موقع تو مل ہی جائے گا۔"

اور وہ ٹیکسی کو اوٹ میں کھڑا کر کے کھنڈر میں داخل ہو گئے۔

"کیوں نہ پہلے ان کھنڈرات کی سیر کر لی جائے۔"

"پہلے کر تو چکے ہیں۔"

"اس وقت ہم کھنڈرات کی سیر نہیں کر رہے تھے۔ دشمنوں کو تلاش کر رہے تھے۔" محمود نے گویا یاد دلایا۔

"ضرور سیر کرو۔ میں یہیں بیٹھتا ہوں۔"

"تمہارا یہ بھائی کچھ بیزار سا لگتا ہے۔" جمال پاشا نے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ خود کو کام چور ظاہر کرنا اس کا مشغلہ ہے۔"

"حیرت ہے۔ یہ بھی کوئی مشغلہ ہو سکتا ہے۔"

"جی ہاں! آپ خوشی سے حیران ہو سکتے ہیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"ایسی باتیں۔ جن میں کوئی کام کی بات نہیں ہوتی۔ یہ کرنے کا شوقین ہے۔"

"بھئی اب میری اتنی بھی تعریفیں نہ کریں۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"بہت بہتر!" محمود اور فرزانہ نے ایک ساتھ کہا۔

فاروق وہیں بیٹھ گیا اور وہ تینوں آگے بڑھ گئے۔ یہ ایک بہت طویل کھنڈر تھا۔ اسے دیکھ کر انہیں حیرت ہونے

لگی۔ اور پھر فرزانہ رکتے ہوئے بولی:

"نہیں محمود۔ مزا نہیں آ رہا۔"

"کیا مطلب؟" محمود چونکا۔

"فاروق کے بغیر کھنڈر کی سیر کا مزا نہیں آ رہا۔"

"فاروق کے بغیر یا اس کی باتوں کے بغیر۔"

"یہی سمجھ لو۔" وہ بولی۔

"تو پھر چلو۔ اس کی منتیں کرتے ہیں۔" محمود نے جھنا کر کہا۔

وہ واپس مڑے۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" جمال پاشا نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ آپ کا تکیۂ کلام تو نہیں ہے۔" فرزانہ بولی۔

"نن۔ نہیں۔"

"جب فاروق ساتھ ہوگا تو سیر کا لطف ہی کچھ اور ہوگا۔" فرزانہ نے کہا۔

آخر وہ پھر فاروق کے پاس پہنچ گئے۔

"حیرت ہے۔ اتنی جلدی سیر مکمل کر لی۔"

"نہیں۔ ابھی شروع بھی نہیں کی۔"

"کیوں۔ کھنڈر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے کیا؟"

"ہاں! تمہارے بغیر یہ کاٹ کھانے کو ہی دوڑ رہا ہے۔"

"اچھا بابا۔ چلو۔ ویسے میں جانتا تھا۔ تم میرے بغیر اس کی سیر نہیں کر سکو گے۔"

"تب پھر یہاں کیوں رُک گئے تھے؟" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"بس ذرا۔ تمھارا حوصلہ آزما رہا تھا۔"

"ہوں! کوئی بات نہیں۔ موقع ملا تو ہم بھی تمھارے حوصلے کو آزمائیں گے۔" فرزانہ نے پاؤں پٹخے۔

"عجیب بہن بھائی ہیں۔" جمال پاشا بولا۔

"صرف عجیب ہی نہیں۔ غریب بھی ہیں۔"

"غریب تو خیر نہیں لگتے آپ لوگ۔"

"اس وقت تو غریب ہی ہیں۔"

کھنڈر کی سیر شروع ہوئی۔ ایک دیوار کے ساتھ انھیں ایک کھائی نظر آئی۔

"میں اس کھائی میں چھلانگ لگائے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"ضرور لگاؤ۔ ہمیں کیا۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"کہنے کا مطلب یہ کہ تم لوگوں کو بھی میرے ساتھ چھلانگ لگانا ہوگی۔"

"ہم اتنے پاگل نہیں ہیں۔"

"خیر۔ دیکھتی ہوں۔ کیسے نہیں لگاتے چھلانگ۔"

اس نے کہا اور کود گئی۔ محمود اور فاروق نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"بھئی اوپر مزا نہیں آرہا۔" محمود بولا۔

"میں جانتا تھا۔ تم یہی کہو گے۔" فاروق نے کہا اور خود بھی چھلانگ لگا گیا۔ اس کے بعد محمود کود گیا۔

"تو کیا۔ میں بھی آؤں۔" جمال پاشا نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں! آ ہی جائیں۔ ورنہ آپ اس کھائی کی سیر سے محروم رہ جائیں گے اور آپ کو حسرت ہی رہے گی۔ پھر کہا کیجیے گا، ہائے وُہ کھائی۔"

جمال پاشا نے مُسکراتے ہوئے چھلانگ لگا دی۔

"محمود۔ ذرا اپنا چاقو دینا۔"

"خیریت۔ چاقو کا خیال کیوں آ گیا؟"

"اس کھائی نے ولا دیا۔ چاقو نکالو۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

محمود نے جھک کر ایڑی سرکائی اور چاقو نکال کر فرزانہ کو دے دیا۔

"یہ۔ یہ چاقو رکھنے کی کون سی جگہ ہے۔" جمال پاشا نے حیران ہو کر کہا۔

"خفیہ جگہ۔ چاقو بھی خفیہ قسم کا ہے۔" فارُوق مسکرایا۔

"خفیہ چاقو۔" جمال پاشا بڑبڑایا۔

"ہاں! ویسے یہ کسی ناول کا نام بھی ہو سکتا ہے۔" فاروق نے کہا۔

"ناول کا نام۔ کیا مطلب؟"

"مسٹر پاشا۔ آپ کس کس بات کا مطلب پوچھیں گے۔ رہنے دیں۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"کیا آپ کو مجھ پر غصہ آ رہا ہے؟"

"نہیں۔ اس پر۔ جس کے بغیر فرزانہ کھنڈر کی سیر تک نہیں کر سکتی۔"

"ہاں! اس بات پر تو مجھے بھی حیرت ہوئی تھی۔"

"زیادہ حیران نہ ہوں۔ ابھی حیران ہونے کے نہ جانے کتنے موقعے آئیں گے۔"

"یہ۔ یہ آپ کس طرح کہ سکتے ہیں۔ کیا آپ نجومی ہیں؟" جمال پاشا بولا۔

"نجومیوں کی ایسی کی تیسی۔ جھوٹے کہیں کے۔"

"کک۔ کون۔ میں؟" جمال پاشا نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں۔ نجومی۔ دوسروں کے مستقبل کا حال بتاتے ہیں اور اپنی موت کے دن کا انہیں پتا نہیں ہوتا۔ ان کو جھوٹا نہ کہوں تو کیا کہوں۔"

"کہ لو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" محمود نے منہ

بنا کر کہا۔

"ارے۔ فرزانہ تم کیا کرنے لگیں؟"

"کھنڈر کا جائزہ۔ یہ دیکھو۔ نیچے سنگ سرخ موجود ہے۔" فرزانہ بولی۔

"تو پھر۔ اس سے کیا۔" فاروق بولا۔

"یہ ضرور کوئی محل تھا۔" اس نے کہا۔

"ہو گا، ہمیں کیا۔"

فرزانہ اب تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔ چاقو کی مدد سے مٹی اِدھر اُدھر ہٹتی جا رہی تھی۔ اور پھر انھوں نے ایک فرش دیکھا۔

وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ فرش بہت نفاست سے بنایا گیا تھا۔

"کوئی بہت ہی شوقین بادشاہ تھا جس نے یہ محل بنایا تھا۔"

"آخر ہمیں ان باتوں کا کیا فائدہ۔" فاروق بولا۔

"محمود۔ اگر ہم کوشش کریں تو سرخ پتھر کے اس ٹکڑے کو یہاں سے ہٹا سکتے ہیں۔"

"اور ہٹا کر کیا کریں گے؟"

"میں محسوس کر رہی ہوں۔ اس فرش کے نیچے کوئی اور کمرہ

موجود ہے۔"

"تو پھر۔ ہمیں کیا۔"

"ذرا غور کرو۔ کھنڈر کا ایک ایسا کمرہ۔ جو ابھی کھنڈر نہیں بنا۔ یہ کس قدر دل چسپ بات ہوگی۔"

"مجھے تو اس میں کوئی دل چسپی والی بات محسوس نہیں ہو رہی۔"

"اپنے دماغ کے دروازوں کو کھول دو۔ تب محسوس ہوگی۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"ہائیں۔ تو کیا تم بھی فرزانہ کا ساتھ دو گے۔" فاروق منہ بنا کر بولا۔

"ہاں! بلکہ مسٹر کمال پاشا بھی۔" محمود بولا۔

"کمال نہیں جمال۔"

"اوہ ہاں۔ کمال تو آپ کے بھائی کا نام ہے۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"جی نہیں۔ انعام۔" اس نے کہا۔

"کھنڈر کی آب و ہوا نے شاید تمھاری یادداشت پر بُرا اثر ڈالا ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"خیر! اگر تم ساتھ نہیں دینا چاہتے تو نہ سہی۔ ہم تینوں مل کر یہ کام کریں گے۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"کیا کروں۔ تم پر ترس آ جاتا ہے۔ آؤ۔"

انھوں نے مل کر زور لگایا۔ فرزانہ چاقو کی مدد سے اس کے کنارے پہلے ہی جھاڑ چکی تھی۔ اس کے باوجود انھیں پورا زور لگانا پڑا۔ تب کہیں جا کر وہ پتھر وہاں سے ہٹا۔ اور اس کے ہٹتے ہی انھوں نے نیچے خلا دیکھا۔

"فاروق۔ تمھاری جیب میں پنسل ٹارچ ہوگی۔" فرزانہ جلدی سے بولی۔

"تو پھر۔ تمھیں اس سے کیا۔"

"جلدی نکالو۔ وقت نہ ضائع کرو۔"

"جلدی تو یہ نکال چکا۔" محمود مسکرایا۔

"کیوں۔ یہ کیا بات ہوئی۔ پنسل ٹارچ نکالنے میں کیا دیر لگتی ہے۔"

"جس شخص کی جیب میں ایک سو ایک چیزیں بھری ہوں۔ وہ جلدی کس طرح نکال سکتا ہے۔" فرزانہ نے کہا

"لیکن یہ بھی تو سوچو کہ ایک سو ایک چیزیں۔ ان گنت موقعوں پر کام آ چکی ہیں۔"

"خیر۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔"

آخر فاروق پنسل ٹارچ نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ انھوں نے پنسل ٹارچ کی روشنی نیچے ڈالی۔ اور دھک سے رہ

گئے۔ نیچے واقعی ایک کمرہ تھا۔ اور کمرہ بھی شاہی دربار کی قسم کا۔ ہر چیز صاف ستھری اور تر و تازہ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے بادشاہ اور درباری ابھی ابھی اُٹھ کر گئے ہوں۔

"ہم۔ ہم نیچے جائیں گے۔" فرزانہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اور نیچے جا کر کیا کریں گے؟"

"کمرہ استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ورنہ اس حد تک صاف ستھرا ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں۔" محمود نے کہا۔

"لیکن اگر ہم نے چھلانگیں لگائیں تو ہڈی پسلی ضرور ایک ہو جائے گی۔ اور پھر واپس اوپر آنے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آ رہا۔" فاروق نے اعتراض کیا۔

"کچھ بھی ہو۔ میں نیچے ضرور اُتروں گی۔ اگر تم ڈر رہے ہو تو بے شک اوپر ہی رہو۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"عقل مندی کا تقاضا بھی یہی ہے۔" محمود نے کہا۔

"کیا مطلب؟" فرزانہ چونکی۔

"سب نیچے جا کر کیوں پھنسیں۔ صرف تم کیوں نہ پھنسو۔ ہم تمھیں نکالنے کی کوئی تدبیر تو کر سکیں گے۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔"

"لیکن اس کی ہڈی پسلی کا کیا سوچا ہے۔" فاروق نے فکرمند ہو کر کہا۔

"یہ میرا ہاتھ پکڑ کر لٹکے گی۔ اور نیچے چھلانگ لگائے گی، اس طرح کچھ تو فاصلہ کم ہو گا۔"

"اس کے باوجود چوٹ ضرور لگے گی۔" فاروق بولا۔

"آپ بھی عجیب بہن بھائی ہیں۔ ابھی تو لڑ رہے تھے۔ اب فکر مند ہوئے جا رہے ہیں۔"

"جی بس۔ ہم ذرا اسی قسم کے بہن بھائی ہیں۔" فاروق نے کہا۔

فرزانہ نے محمود کا ہاتھ پکڑا اور نیچے لٹک گئی۔ محمود نے اپنے سینے کو فرش پر چپکا دیا۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ نیچے ہو سکے۔ اور پھر فرزانہ نے اللہ کا نام لے کر چھلانگ لگا دی۔ دھم کی آواز سنائی دی۔

ساتھ ہی محمود بے چین ہو کر بولا:

"کیا حال ہے فرزانہ؟"

"کوئی خاص چوٹ نہیں آئی۔ فکر نہ کرو۔" فرزانہ نے عجیب سی آواز میں کہا۔

"لیکن تمھاری آواز کہہ رہی ہے کہ چوٹ آئی ہے۔"

"آواز کو مارو گولی۔ اور فاروق کی پنسل ٹارچ پھینک دو،

یہاں اندھیرا ہے۔"

انھوں نے ٹارچ کو روشن کیا اور اسی حالت میں نیچے گرا دیا۔ فرزانہ نے اسے کیچ کر لیا، ساتھ ہی اس کے منہ سے نکلا:

"اوہو۔ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔"

اس کی آواز سے بے پناہ خوف ٹپک رہا تھا۔

پرانی تصاویر

"کیا بات ہے فرزانہ۔ خیر تو ہے؟" محمود فوراً بولا۔

"محمود۔ فاروق۔ تم دونوں کو نیچے آنا ہی ہوگا۔ ہاں جمال پاشا صاحب کو مدد کے لیے اوپر ہی رہنے دو۔"

"اچھی بات ہے فرزانہ۔ ہم آ رہے ہیں۔" محمود نے کہا۔

فاروق نے محمود کا ہاتھ پکڑا اور کود گیا، اس کے بعد محمود جمال پاشا کی مدد سے نیچے اتر گیا۔ پنسل ٹارچ کی روشنی میں انھوں نے کمرے کو دیکھا۔ یہ ایک ہال تھا اور بلاشبہ ایک شاہی دربار تھا۔ مستطیل ہال کی سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک عظیم الشان تخت موجود تھا۔ دائیں بائیں دیواروں کے ساتھ ساتھ شاہانہ انداز کی کرسیاں رکھی تھیں۔ دوسری طرف کی دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ اس دروازے کے آس پاس فرش پر تازہ خون پھیلا ہوا تھا:

"اس خون کو دیکھ کر میں نے تم دونوں کو بلانے کا فیصلہ

رکیا ہے۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔" محمود نے کہا اور جھک کر انگلی سے خون کو چھو کر دیکھا۔

"یہ بلاشبہ خون ہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسانی خون ہے یا کسی جانور کا۔ بہرحال یہاں تازہ خون کی موجودگی ثبوت ہے اس بات کا۔ کہ اس کھنڈر کو استعمال کیا جا رہا ہے۔" محمود نے جلدی جلدی کہا۔

"اور کیا عجب۔ استعمال کرنے والا وہ پُر اسرار باس ہی ہو۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ چہروں پر حیرت دوڑ گئی۔

"اب میں اس دروازے کی طرف جائے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"ٹھیک ہے، لیکن اس سے پہلے مسٹر کمال پاشا۔ سوری جمال پاشا کو صورتِ حال بتا دو۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔" فاروق بولا۔

"مسٹر جمال۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، وہ پُر اسرار باس اس کھنڈر میں ہی کہیں رہتا ہے۔ یہ ہال شاہی دربار کی طرح کا ہے۔ اور اس کے فرش پر تازہ خون بھی موجود ہے۔"

"کیا کہا۔ تازہ خون۔" جمال پاشا کانپ اٹھا۔

"ہاں! بالکل تازہ خون۔ ہال میں ایک دروازہ بھی ہے۔ ہم دروازے کے دوسری طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ ایک کام کریں۔"

"بتائیے۔ میں ہر کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔" اس نے کہا۔

"فوری طور پر شہر چلے جائیں اور انسپکٹر رومان بھائی کو ساری بات بتا دیں۔ وہ اپنے کانسٹیبلوں کو لے کر یہاں آ جائیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں ابھی جاتا ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ۔ جلد از جلد آنے کی کوشش کرنا۔"

"ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔"

انھوں نے جمال پاشا کے جانے کی آواز سنی اور دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ خود کو خون سے بچاتے ہوئے محمود نے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر کھینچا، لیکن دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔

"دروازے کو کسی نہ کسی طرح کھولنا ہو گا۔" فرزانہ نے کہا۔

"اچھا!" محمود نے کہا اور چاقو کی مدد سے دروازے میں سوراخ کرنے لگا۔ آخر پندرہ منٹ کی محنت کے بعد دروازہ

کھسل گیا اور وہ دوسری طرف آ گئے۔ انھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ اب وہ ایک اور ہال میں تھے۔ اس ہال میں ہاتھ کی بنائی ہوئی بڑی بڑی تصاویر دیوار پر لگی تھیں۔ ان سب تصاویر میں شاہی لباس پہنے ہندو نظر آئے۔

"یہ تو واقعی شاہی دربار ہے۔ اور یہ محل ضرور کسی زمانے میں ہندو راجاؤں کا تھا۔"

"اور اب یہ اس پُر اسرار باس کے قبضے میں ہے۔ اسے کسی طرح معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس کھنڈر کے نیچے ایک بہترین شاہی دربار موجود ہے۔ اور اس کے علاوہ اور ہال بھی ہیں۔ لہٰذا اس نے یہاں ڈیرہ جما لیا۔"

"ارے۔ فرزانہ۔ یہ تم ان تصاویر کو اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہو؟"

"اس لیے کہ یہ تصاویر بہت پُرانی ضرور ہیں، لیکن ابھی تک صاف ستھری ہیں۔ ان کا رنگ تک نہیں جھڑا۔ اور اس کا مطلب ہے۔ ان کی باقاعدہ حفاظت کی جاتی ہے۔"

"حفاظت کی جاتی ہے۔" محمود بڑبڑایا۔

"ہاں! آخر اس باس کو ان تصاویر سے کیا دل چسپی ہے۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" فاروق نے اسے بغور دیکھا۔

"یہ کہ کہیں ان تصاویر سے اس کا کوئی تعلق تو نہیں۔"

"اوہ۔ ہاں! اس کا امکان ہے۔" محمود بولا۔

عین اسی وقت ان کے پیچھے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ وہ بوکھلا کر مُڑے۔ انھوں نے ایک لمبے قد کا آدمی دیکھا جو انھیں خوف زدہ انداز میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا، پھر وہ چونک کر بھاگا:

"محمود۔ فاروق۔ دوڑو۔ روکو اسے۔" فرزانہ چلائی اور خود بھی دوڑ پڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس ہال سے نکل جاتا۔ تینوں نے اسے جا لیا۔ وہ بھی پلٹ کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ یہ اچھل کر تین اطراف میں بٹ گئے۔ اب وہ ان میں سے ایک وقت میں صرف ایک پر حملہ کر سکتا تھا؛ چنانچہ محمود پر جھپٹا ہی تھا کہ فرزانہ نے سر کی ٹکر اس کی کمر پر رسید کی، فاروق نے اس کا بازو پکڑ کر ایک زور دار جھٹکا مارا۔ نتیجہ یہ کہ وہ محمود تک نہ پہنچ سکا۔ یہ دیکھ کر محمود اُچھلا اور اس کے دونوں پیر اس کے سینے پر لگے۔ اب وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ دھڑام سے گرا۔ بس پھر کیا تھا۔ تینوں اسے چھاپ بیٹھے۔ جلد ہی وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

"آؤ بھئی۔ اب وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا۔"

انھوں نے دیکھا۔ ہال میں ایک آدمی کی لاش پڑی تھی۔ اسے بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ اسی کا خون بہ کر دروازے سے دوسرے ہال میں چلا گیا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھے۔ ایک برامدے کا موڑ مُڑے ہی تھے کہ کچھ فاصلے پر چھ مسلح آدمی کھڑے نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں شین گنیں تھیں۔ وہ ٹھٹک کر رُک گئے۔ سوالیہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ لے دے کے ان کے پاس پستول اور محمود کا چاقو تھا۔ اور ان سے وہ چھ شین گنوں والوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، فرزانہ نے انھیں واپس مُڑنے کا اشارہ کیا۔ برامدے کا موڑ مُڑتے وقت انھوں نے ایک اور راستا بھی مُڑتے دیکھا تھا۔ اب وہ اس طرف بڑھے۔ ایک منٹ بعد وہ ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ کمرہ عجیب و غریب قسم کے آلات سے اٹا پڑا تھا۔ اس میں سائنسی آلات بھی تھے۔ اور ایسے آلات بھی جو جرائم پیشہ وارداتیں کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، لیکن کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ وہ بے دھڑک کمرے میں داخل ہو گئے۔ اور عین اسی وقت الارم پورے زور سے بجنے لگا۔

وہ بوکھلا گئے۔ فوراً کمرے سے نکلے اور اس طرف بڑھے، جس طرف سے آئے تھے۔ یہاں تک کہ شاہی دربار میں آ کر

دبک گئے۔ جلد ہی انھوں نے بہت سے دوڑتے قدموں کی آوازیں سُنیں۔ کچھ دیر بعد آوازیں دُور ہو گئیں۔

"آؤ۔ دیکھیں۔ شین گنوں والے اب وہاں ہیں یا نہیں۔" فرزانہ نے دبی آواز میں کہا۔

وہ تیز تیز قدم اُٹھاتے پھر اسی جگہ پہنچے، لیکن وہاں اب وہ چھ کے چھ نہیں تھے۔ یہ دیکھ کر وہ آگے بڑھے، اب انھیں ایک اور موڑ مُڑنا پڑا۔ جُوں ہی مُڑے۔ انھیں ایک صحن دکھائی دیا۔ اس صحن کے چاروں طرف جیل کی کوٹھریاں بنی تھیں اور ان میں انسان بند تھے۔ پچھلے ہال کمرے کو چھوڑ کر ہر جگہ مناسب روشنی تھی۔

"ہائیں۔ تم لوگ آ گئے۔ جلدی کرو۔ یہ الارم کیسا بجا تھا؟" انسپکٹر جمشید کی آواز نے انھیں چونکا دیا۔

"وہ مارا۔" محمود نے چلّا کر کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

دُوسرے ہی لمحے اس نے چاقو کی مدد سے تالا کاٹ دیا:

"سب تالے کاٹ دو۔ تم نے بتایا نہیں۔ الارم کس طرح بجا۔"

"ہم باس کے کمرے میں گھس گئے تھے۔"

"اور کیا وہ وہاں تھا؟"

"نہیں!"

جلدی جلدی انھوں نے سب کو آزاد کرایا اور پھر سب آگے بڑھے۔ برامدے کا موڑ مڑے ہی تھے کہ دوسری طرف سے دشمن آتے نظر آئے۔ دشمن دھک سے رہ گئے۔ ان کے ہوش اڑ گئے۔ وہ ایک دوسرے کے اس قدر نزدیک آچکے تھے کہ اب سٹین گنوں سے ان پر گولیاں نہیں چلائی جا سکتی تھیں۔ انسپکٹر جمشید بجلی کی طرح حرکت میں آئے اور ان پر ٹوٹ پڑے۔ خان رحمان اور وہ تینوں بھی آگے بڑھے۔ قیدیوں میں بھی جوش بھر گیا۔ اب وہ سب مجرموں کو بری طرح مار رہے تھے۔ جلد ہی وہ ادھ موئے ہو گئے۔

"جلدی بتاؤ۔ باس کہاں ہے۔ ورنہ سٹین گن سے گولیاں برسا دوں گا اور تم چھلنی ہو جاؤ گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"وہ۔ وہ کچھ دیر پہلے ہوٹل گئے ہیں۔"

"ہوٹل گئے ہیں۔ تو کیا اس محل کے تہ خانے سے ہوٹل تک کوئی خفیہ راستا جاتا ہے؟"

"ہاں! ایک سرنگ۔ جو شاہی محل کے نیچے سے ہوٹل جانباز تک بنائی گئی تھی۔ اس وقت وہاں ہوٹل نہیں تھا۔ ایک محفوظ عمارت تھی۔ جہاں فرار ہونے کا انتظام رہتا تھا۔ تاکہ کسی وقت راجا کو بھاگنا پڑے تو اس سرنگ کے ذریعے اندر ہی اندر اس عمارت تک پہنچ جائے۔"

"اوہ۔ سرنگ دکھاؤ۔ اور یہ بھی بتاؤ۔ باس کون ہے؟"

"ہم اس کا نام نہیں جانتے۔ شکل سے ضرور پہچانتے ہیں، کیوں کہ وہ اکثر یہاں آتا رہتا ہے۔ ابھی آنے والا ہے، الارم کی وجہ سے۔"

سرنگ کا پوچھ کر انھوں نے ان سب کو کوٹھریوں میں بند کر دیا اور ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے جس لمبے آدمی کو بے ہوش کیا تھا، اسے دیکھ کر انسپکٹر جمشید چونک اٹھے:

"ارے! ہوٹل جانباز میں اسی سے میری ملاقات ہوئی تھی۔"

آخر وہ سرنگ میں چل پڑے۔ ان کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ ان پر بلا کا جوش طاری تھا۔ سرنگ میں روشنی کا مناسب انتظام تھا۔ ایسے میں اچانک دوسری طرف سے انھیں کوئی آتا دکھائی دیا۔ وہ یک دم رک گئے۔

ایک لمبے قد کا آدمی چلا آرہا تھا۔

"ارے۔ یہ تو وہ ہے۔" خان رحمان کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

"وہ۔ کون وہ؟"

"وہ جس نے میرا پرس اڑایا تھا۔ اس کا نام مائیکل ہے۔"

خان رحمان نے کہا ۔

" ہوں !"

اُدھر مائیکل نے ان کو دیکھ لیا ۔ وہ بھڑک کر اُلٹے قدموں بھاگا ۔

انسپکٹر جمشید نے دو تین لمبی لمبی چھلانگیں لگائیں اور اس کی کمر پر پہنچ گئے ۔ ان کے پاؤں کی ٹھوکر اس کی پنڈلی پر لگی ۔ وہ چیخ مار کر گرا ۔ اور پھر انسپکٹر جمشید نے اسے اُٹھنے نہ دیا ۔ ادھ موا کرنے کے بعد وہ اسے اٹھا کر پھر محل میں لائے ۔

" یہی ہے باس ؟" انسپکٹر جمشید نے سٹین گنوں والوں سے پوچھا ۔

" جی ہاں ! یہی باس ہے ہمارا ۔"

" ہوں ۔ شاید یہ میک اَپ میں ہے ۔" یہ کہ کر وہ آگے بڑھے اور اسے اچھی طرح ٹٹولا ، پھر کافی محنت کے بعد اس کے چہرے سے پلاسٹک میک اَپ اُتارنے میں کامیاب ہو سکے ۔

" ارے ! یہ تو ہندو ہے ۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا ۔

" اوہ ۔ وہ تصاویر ۔" فاروق چونک اُٹھا ۔

" یہاں ایک ہال میں ہندو راجاؤں کی تصاویر لگی ہیں ۔ کیا تمہارا اشارا ان کی طرف ہے ؟"

" ہاں !"

" آؤ ۔ اسے وہیں لے کر چلتے ہیں ۔"

تصویروں والے ہال میں پہنچ کر انھوں نے ایک ایک تصویر کو غور سے دیکھا ۔ اور پھر ایک تصویر کے سامنے رُک گئے ۔

" اس کی شکل صورت مائیکل سے ملتی جلتی ہے ۔ کیوں مائیکل ۔ یہ تمہارا کیا لگتا ہے ؟"

" دادا ۔" اس نے مرجھائے ہوئے انداز میں کہا ۔

" آخر یہ سب کیا ہے ۔ تم خود ہی بتا دو ۔"

" میرے باپ نے مرنے سے پہلے اس کھنڈر کے نیچے دادا کے محل کے بارے میں بتایا تھا ۔ اس کے بعد میں جرائم کے راستے پر چل نکلا ۔ میں نے بہت سی کامیاب وارداتیں کیں ، پھر میں نے ایک گروہ بنا لیا ۔ اور اس گروہ کی مدد سے جرائم پیشہ لوگوں کے ریکارڈ حاصل کرنے لگا ۔ پہلے پروگرام ان کو بلیک میل کرنے کا تھا ، لیکن پھر محل کا خیال آ گیا ۔ اور میرے ذہن میں اس شہر پر حکومت کرنے کا خیال رینگنے لگا ۔ میں نے منصوبہ بندی شروع کر دی ۔ پھر ہوٹل جانباز خرید لیا ۔ کیوں کہ سُرنگ اس کے نیچے تک آتی تھی ۔ اور اس طرح میں بہت جلد اس شہر کا ہوّا بن گیا ۔ اور باہر سے آنے والوں کو

پھانسنے لگا۔ یہ ہے کُل کہانی "

" اور کیا تم وارداتوں کے دوران کبھی گرفتار نہیں ہوئے؟"

"نہیں! میں نے جتنی بھی وارداتیں کیں۔ پوری کامیابی سے کیں۔ اور اسی وجہ سے میرا حوصلہ بڑھتا گیا"

اس کا مطلب ہے۔ تم پہلی اور آخری بار گرفتار ہوئے ہو" فاروق نے شوخ لہجے میں کہا۔

اور ان کے چہروں پر مُسکراہٹیں پھیل گئیں۔ اسی وقت اوپر فائرنگ کی آوازیں سُنائی دیں۔ جمال پاشا انسپکٹر رومان بھائی کو لے کر آگیا تھا۔ جمال پاشا۔ جس کا بھائی بھی ان قیدیوں میں تھا۔